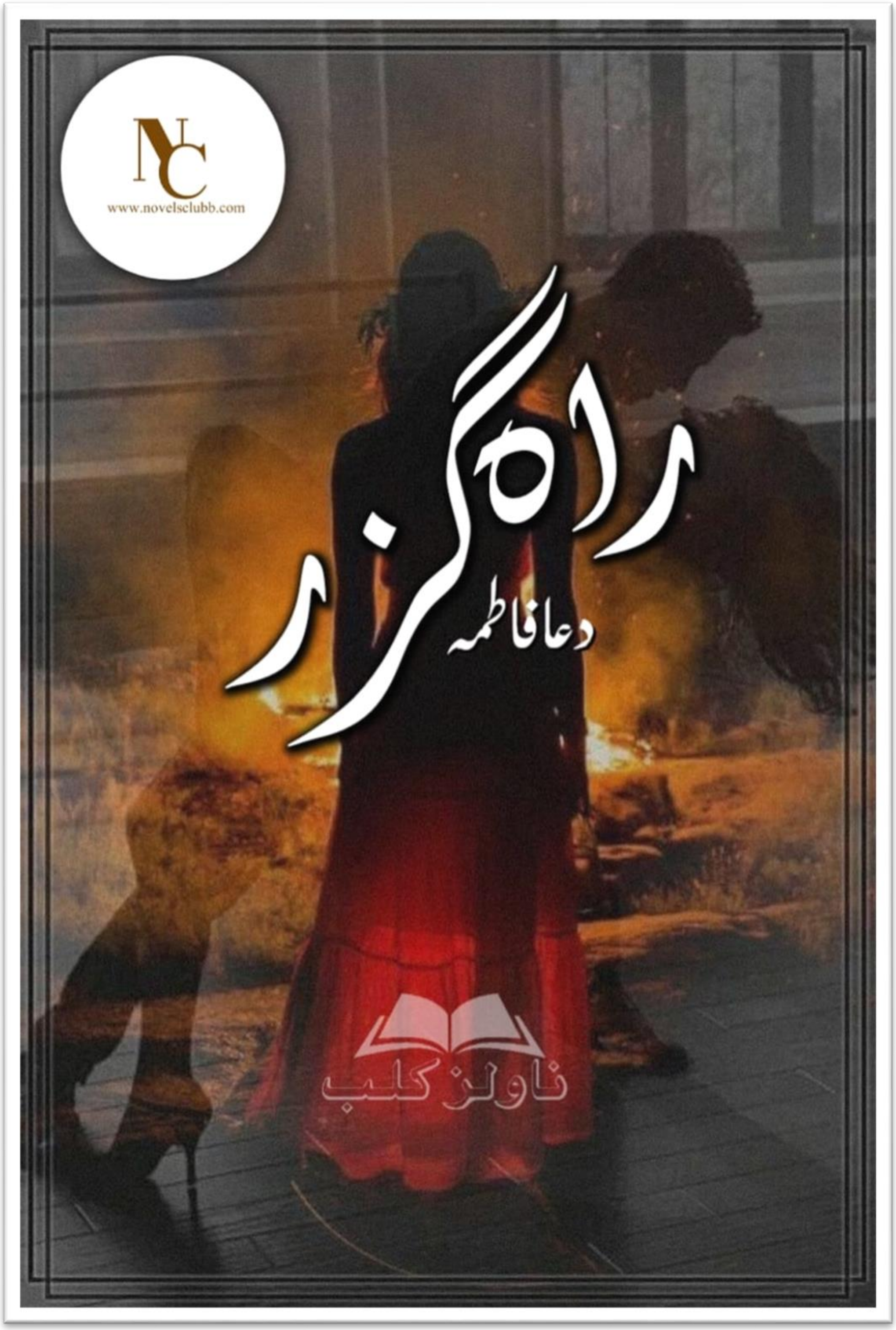
www.novelsclubb.com
راہ گزر
دعا فاطمہ
ناولز کلب

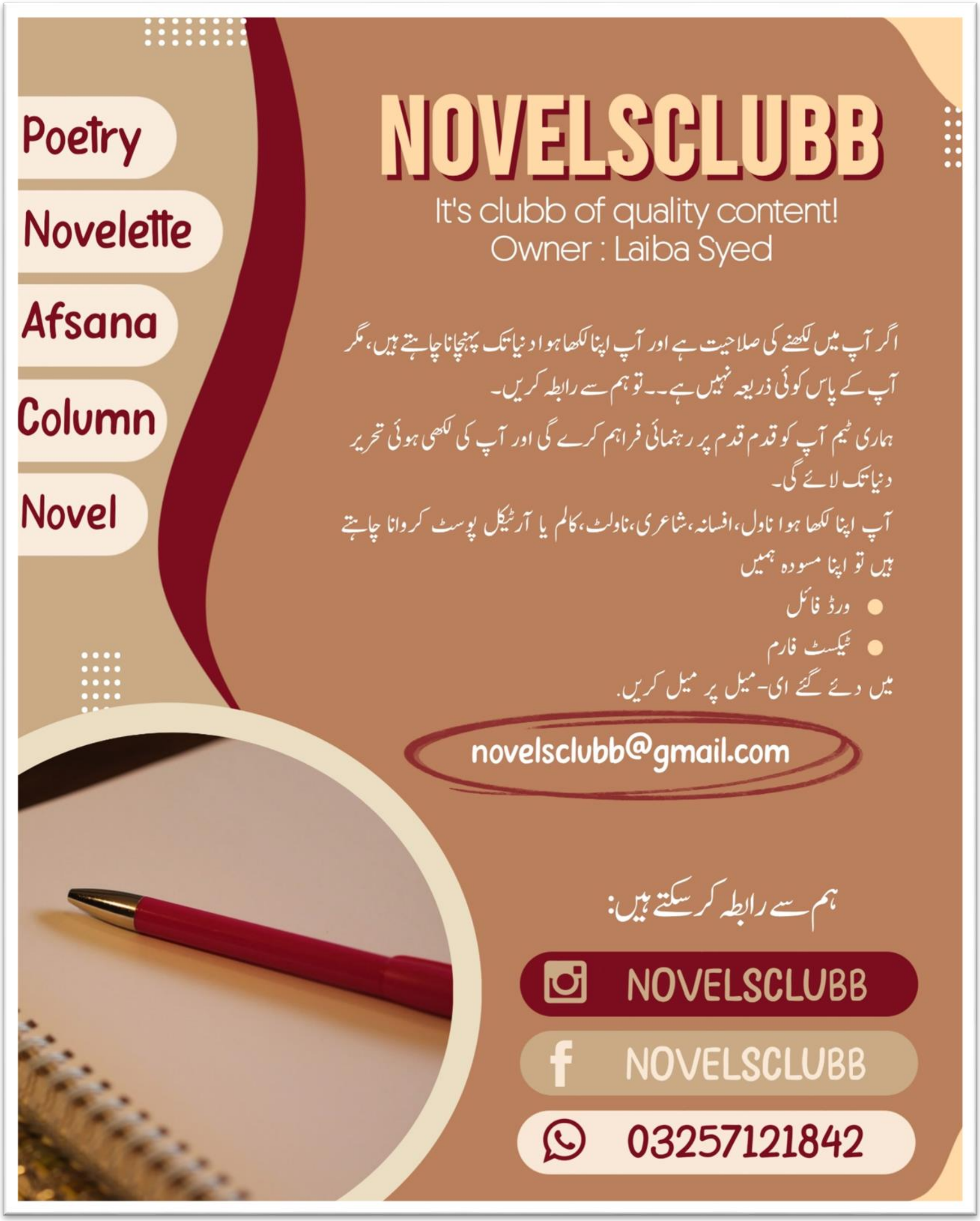

Poetry
Novelette
Afsana
Column
Novel
NOVELSCLUBB
It's clubb of quality content!
Owner : Laiba Syed
اگر آپ میں لکھنے کی صلاحیت ہے اور آپ اپنا لکھا ہوا دنیا تک پہنچانا چاہتے ہیں، مگر آپ کے پاس کوئی ذریعہ نہیں ہے۔۔تو ہم سے رابطہ کریں۔
ہماری ٹیم آپ کو قدم قدم پر رہنمائی فراہم کرے گی اور آپ کی لکھی ہوئی تحریر دنیا تک لائے گی۔
آپ اپنا لکھا ہوا ناول، افسانہ، شاعری، ناولٹ، کالم یا آرٹیکل پوسٹ کروانا چاہتے ہیں تو اپنا مسودہ ہمیں
ورڈ فائل
ٹیکسٹ فارم
میں دئے گئے ای-میل پر میل کریں.
novelsclubb@gmail.com
ہم سے رابطہ کر سکتے ہیں:
NOVELSCLUBB
NOVELSCLUBB
03257121842

راہ گزر

از قلم

دعا فاطمہ

www.novelsclubb.com

انتساب

میری زندگی اور اس کی تلخیوں کے نام۔۔۔زندگی کے حقیقی چہرے کے نام۔۔۔زندگی کی تلخ گہرائیوں کے نام!

www.novelsclubb.com

پیش لفظ

یہ کہانی ہے ایمان زاویار کی۔۔۔اس ایمان زاویار کی جو زندگی کے شروع ہوتے ہی اس کی تلخیوں سے جا ملتی ہے۔اس ایمان زایار کی جو زندگی گزرنے کے ساتھ ساتھ اپنا ایمان کھو بیٹھتی ہے۔اس ایمان زاویار کی جس کی زندگی کی تلخیاں ہی اسے اس کا امیان واپس لوٹاتی ہیں۔اس ایمان زاویار کی جو صرف اپنے آپ کے ساتھ اس دنیا میں اکیلی رہ جاتی ہے۔

کہانی ہے زندگی کی۔اس زندگی کی جو اپنا خوبصورت نقاب اتار پھینکتی ہے۔اس زندگی کی جس کی بدصورت حقیقت سامنے آتی ہے۔اس زندگی کی جو انسان کو چاروں اور سے گھیرے اس کو تنہا کر ڈالتی ہے۔

کہانی ہے راتوں کو رونے والوں کی، کہانی ہے سسکنے والوں کی، کہانی ہے اکیلے رہ جانے والوں کی۔۔۔

کہانی ہے موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر غرّانے والے رمیص جہانزیب کی۔۔۔

کہانی ہے دور پردیس میں کہیں کھو جانے والے ارتضی مراد کی۔۔۔

داستان ہے غزل ارشد کی۔۔۔داستان ہے ایمان زاویار کی۔۔۔

اس کہانی کی سب سے ڈیزرونگ لکھاری میری نانی ہیں جنھوں نے میری تھیم سن کر ایک ہی بار میں مجھے میری کہانی کا نام بتا کر مجھے میری ناول کا پلاٹ، کلائمیکس اور اختتام تھما دیا۔میری کہانی کو ایک نیا رخ بخشا۔ارشد شریف شہید کی سوانح عمری کچھ الگ لفظوں میں بیان کر کے میں نے ایک اور تھیم کو اس ناول کا حصّہ بنایا ہے۔سب سے آخر میں میری پوری کوشش ہے کہ میں اپنے ذہن میں قائم ہوئے اسباق کو باآسانی اس ناول کے ذریعے آپ تک پہنچا سکوں۔

والسلام

دعا فاطمہ

راہ گزر

از دعا فاطمہ

قسط 6

سفر کے مراحل کچھ یوں شروع ہوئے

ابتداء جو ہوئی، تو اشک بہانے لگی

کچھ وقت کے مظالم کو یوں ڈھانے لگی

روح جسم سے جیسے یہ جبراً نکالنے لگی

آہوں اور سسکیوں کو یہ دبانے لگی

ہمت کو جیسے یہ گھٹانے لگی

پھر آیا مرحلہ ابھرنے کا

ذات کی کرچیوں کو سمیٹنے کا

کچھ خواب بننے کا

کچھ باتیں کرنے کا

کچھ مسکرانے کا، کچھ کھلکھلانے کا

بکھری ہمت سمیٹنے کا

سفر میں آگے بڑھنے کا

ظلم کے خلاف جانے کا

ڈٹنے کا اور لڑنے کا

مضبوطی سے آگے بڑھنے کا

www.novelsclubb.com

کہ آئے پھر وہ مرحلہ کہ

جس میں ہو ہر شے کا بدلہ

ہر ظلم کا بدلہ، ہر اشک کا بدلہ

ہر آہ و بکا، ہر سسکی کا بدلہ

ایک حیوان کا انسان کو مارنے کا بدلہ

ایک بے حس کا احساسات کو روندنے کا بدلہ

کہ پھر جو آخری آئے مرحلہ

وہ خوشیوں کا نہیں، تو ہو سکوں کا

وہ کھلکھلاہٹوں کا نہیں، تو ہو رکوع کا

شکر کے طویل سجدوں کا

دعا میں بہے ہنستے آنسوؤں کا

وہ مرحلہ ہو سکوں کا، انصاف کی پرچار کا

دل پہ برستی ٹھنڈی پھوار کا

(از خود)

وہ گھر پہنچی تو اچھی خاصی رات چھا چکی تھی۔ رات کی سیاہی تلے دن کی روشنی دب چکی تھی۔ بارش تھم چکی تھی اور بارش کے بعد والی ٹھنڈی تازگی بخش ہواؤں نے چل کر موسم کو بھی تازگی بخشی ہوئی تھی۔

وہ کل دن کی جاگی ہوئی تھی سو تھکن اور نیند سے آنکھیں بے طرح بوجھل ہوتی محسوس ہو رہی تھیں۔ فریش ہو کر وہ بستر پر آ کر گر سی گئی تھی۔ یونہی لیٹے لیٹے گردن موڑ کر سائیڈ ٹیبل پر پڑا اپنا پرس دیکھا تو بازو بڑھا کر پرس تھام لیا۔ اب وہ پرس کھولے اس میں سے اپنا موبائل نکال

رہی تھی۔ موبائل نکال کر پرس پلنگ پر پاس ہی پھینکا اور پھر لیٹے لیٹے ہی موبائل اٹھائے نگاہوں کے سامنے کیا۔

بہت سے نوٹیفیکیشنز آئے ہوئے تھے۔ مگر اس کی نگاہیں۔۔۔اس کی نگاہیں تو بس ایک نوٹیفیکیشن کی منتظر تھیں۔۔۔وہ ایک نام۔۔۔کوئی ایک میسج۔۔۔کوئی ایک پکار۔۔۔؟؟؟

مگر وہاں ارتضیٰ مراد کے نام کے نیچے کوئی میسج نہ جھلکتا تھا۔ اس نے پھر بھی بے ساختہ اسی کی چیٹ کھولی تھی۔ اور پھر وہ ایک ایک کر کے اس کے سارے میسجز پڑھتی گئی تھی۔ اوپر اسکرول کرتے کرتے اس کی آنکھیں ایک بار پھر نم پڑتی گئی تھیں۔ غزل صحیح کہتی تھی۔ بعض دفعہ کسی انسان کا زندگی سے جانا زندگی کی خوشیاں، مسکراہٹیں، رونقیں اور سکون ساتھ لے جاتا ہے۔ ارتضیٰ مراد بھی اس کی زندگی کی کھلکھلاہٹیں ساتھ لے جا چکا تھا۔ اور پیچھے وہ حسرتوں اور خواہشات میں گھری تنہا رہ گئی تھی۔

جبھی اسکرین پر ارتضیٰ کی چیٹ کے عین اوپر میرال کا نمبر جگمگ کرنے لگا تھا۔ موبائل کی رنگ ٹون بجنے لگی تھی۔ اس نے نم آنکھیں رگڑتے ہوئے کال پک کر کے فون کان سے لگایا تھا۔

"السلام علیکم۔ کیسی ہو؟"، کال یس ہوتے ہی اگلی جانب سے میرال کی ہشاش بشاش سی آواز گونجی تھی۔ ایمان کے لبوں کو بھی بے ساختہ ہی ایک مسکراہٹ نے چھوا تھا۔

"وعلیکم السلام۔۔۔ میں ٹھیک الحمد للہ۔۔۔ آپ سنائیے۔ کیا حال ہیں؟"،اس کا لہجہ کمپوزڈ سا، سنبھلا ہوا تھا۔ نگاہیں سیلنگ پر ٹکی تھیں۔

"میں بھی ٹھیک الحمد للہ۔ تم نے تو اس دن کے بعد فون ہی نہیں کیا، مونی۔ دو چار دفعہ فون کیا، وہ بھی میں نے۔ تم بھول گئی ہو مجھے۔"،وہ خفگی لہجے میں سموئے بول رہی تھی جبکہ ایمان کے لبوں سے تو مسکراہٹ جدا ہو ہی نہیں رہی تھی۔ مونی اس کے اچھے دنوں کا نام تھا۔ کاش وہ

www.novelsclubb.com

ہمیشہ موٹی ہی رہی ہوتی۔ ایمان کبھی بنی ہی نہ ہوتی۔ کاش! کاش کہ وقت تھامنا ممکن ہوتا تو وہ اس وقت کو تھام کر روک دیتی۔۔۔ہائے کاش!

"ارے نہیں۔ ایسی بات نہیں ہے۔ اصل میں غزل کی طبیعت خراب ہو گئی تھی تو انہیں ہسپتال لے گئی تھی کل۔ ابھی آئی ہوں بس۔ کچھ ہی دیر ہوئی ہے۔ نماز پڑھ کر لیٹی ہی تھی ابھی کہ تمہاری کال آ گئی۔"، اس نے تحمل سے بات مکمل کی تو میرال نے سمجھ کر سر ہلایا۔

"اب کیسی ہیں وہ؟"، اس نے پوچھا تو ایمان مسکرا دی۔

"الحمد اللہ۔ ٹھیک ہیں بالکل۔ بیٹی ہوئی ہے ان کی۔۔۔ آج ہی۔"، اس نے مسکرا کر بتایا تو میرال بے ساختہ ہی بے یقینی میں گھری مسکرا دی۔

"ارے ماشاءاللہ۔ تمہاری اور اس کی برتھ ڈے تو پھر ایک ہی دن آئے گی۔۔۔ واہ بھئی۔ ویسے۔۔۔"، بولتے ہوئے اس نے 'ویسے' کو اچھا خاصا کھینچا تھا۔ "ہیپی برتھ ڈے میری موٹی۔"

وہ بولی تو ایمان کا دل باغ باغ ہو گیا۔ میرال کا میسج تو وہ کل رات بارہ بجے ہی پڑھ چکی تھی مگر اس وقت پریشانی کے باعث دھیان نہیں دے پائی تھی۔ اب کے فرصت سے بات ہوئی تو اسے بہت خوشی محسوس ہوئی۔

"تھینک یو سو مچ، میرو۔ میں تمہیں بتا نہیں سکتی کہ میں کتنی خوش ہوں۔۔۔ پتا ہے؟ مجھے ابھی تک یقین نہیں آتا کہ زندگی نے مجھے ایک بار پھر تم سے ملوادیا ہے۔ وہ بھی میری زندگی کے سب سے کٹھن حصّے میں۔۔۔"، وہ شدت جذبات سے بولتی جارہی تھی۔ فرطِ مسرت سے آنکھیں چمک اٹھی تھیں۔ کچھ لوگ ہوتے ہیں جو آنکھوں میں یوں ہی چمک لے آیا کرتے ہیں۔ میرال بھی انہی لوگوں میں سے ایک تھی۔ وہ ایمان کی زندگی کے اہم ترین لوگوں میں سے ایک تھی۔

کچھ دیر بات کرتے رہنے کے بعد ایمان نے کچھ ٹھہر کر یکدم ہی پوچھا تھا۔

"کاکا کیسا ہے، میرو؟"، اس کی بات پر اگلی جانب میرو کی آنکھیں ہلکی گلابی سی پڑی تھیں۔ لب نرمی سے مسکرائے تھے۔

"ٹھیک ہے وہ، الحمدللہ۔"، ایمان کو اس کی آواز اور لہجے میں خاصا اطمینان محسوس ہوا تھا۔ بے اختیار ہی اس کے دل کو بھی طمانیت بخشی کا احساس ہوا تھا۔ سیلنگ کو دیکھتے اسے ایک بار پھر وہ سب یاد آنے لگا تھا۔۔۔ وہی چند سالوں پہلے کے وہ واقعات۔۔۔

کامل کریم عرف کاکا ان سب کا بچپن کا دوست تھا۔ اسکول کا ساتھی۔ ٹیوشن کا یار۔ وہ سب ساتھ کھیلتے ہوئے ہی بڑے ہوئے تھے۔ میٹرک تک ان سب نے ایک ساتھ ہی ماسٹر صاحب کے پاس ٹیوشن پڑھا تھا، جس کے باعث ان کی دوستی بھی کافی گہری ہو چکی تھی۔ وہ سب ساتھ خوش رہا کرتے تھے۔ ایک دوسرے کے ساتھ ہنسی مذاق کرتے، ایک دوست کی ٹانگ کھینچتے، کھلکھلاتے، مسکراہٹیں بکھیرتے۔۔۔ مگر۔۔۔

novelsclubb@gmail
www.novelsclubb.com
IG: @novelsclubb

مگر یہ ان سب کو کافی بعد میں پتا چلا تھا کہ کاکو لنگ کینسر ہے۔۔۔ابھی سے نہیں، کافی سالوں سے۔یہ انکشاف ان سب کو بہت بھاری پڑا تھا۔ان سب کا دل اس روز خون کے آنسو رویا تھا۔کسی اپنے کو تکلیف میں دیکھنا کیا ہوتا ہے،یہ ان سب کو تب پتا چلا تھا جب ان کو باری باری کاکا کی بیماری کا علم ہوا تھا۔۔۔مگر سب سے زیادہ دکھ میں میرال ہی تھی۔

وہ سب ہی اس کی کامل کے لیے پسندیدگی سے اچھی طرح واقف تھے،اور شاید خود کامل بھی۔۔۔معاملہ اس کی جانب سے بھی یہی تھا مگر اس وقت وہ سب اتنے چھوٹے تھے کہ ان کو اپنے احساسات محض وقتی ایٹریکشن لگے۔مگر احساسات کی پختگی کا احساس اس وقت ہوا جب میرال کے اسلام آباد شفٹ ہونے کے باوجود ان کے جذبات میں کوئی فرق نہیں آیا۔

انہی دنوں اپنے نکاح کے بعد روحان نے ان سب کی دعوت رکھی تھی۔اس روز میرال کو کامل کی بیماری کا علم ہوا تھا۔وہ دھماکوں کی زد میں آ گئی تھی۔بے بسی،اذیت، تکلیف کیا ہوتی ہے،یہ اس روز معلوم پڑا تھا۔

novelsclubb@gmail
www.novelsclubb.com
IG: @novelsclubb

وقت یوں ہی تکلیفوں سے پر گزرتا گیا تھا کہ ایک روز اسے ایمان کی کال آئی۔ وہ اسے بتا رہی تھی کہ کاکا کی طبیعت اچانک بگڑ گئی ہے۔ وہ ہسپتال میں داخل ہے۔۔۔ اور اس وقت اپنی بے بسی میرال کو بہت بری لگی تھی۔ بے بسی کسے کہتے ہیں، اسے اس روز معلوم پڑا تھا۔

کچھ ماہ بعد ہی کاکا کو اس کے والدین کینیڈا لے گئے تھے۔ اس کا بقیہ علاج وہیں ہونا تھا۔۔۔ مگر اس روز جب اس کی بات کاکا سے ہوئی تو اسے اس کے لہجے میں ایک الگ امید سی محسوس ہوئی تھی۔

"ڈاکٹروں نے ان تمام سالوں میں پہلی بار امید دلائی ہے کہ میں ٹھیک ہو سکتا ہوں، میرو۔ تم میرے لیے دعا کرو ناں، میرو۔۔۔ میں زندہ رہنا چاہتا ہوں۔ میں مرنا نہیں چاہتا۔۔۔ تم پلیز میرے لیے دعا کرو۔۔۔ مجھے اس وقت تمہاری دعاؤں کی بے حد ضرورت ہے۔"، وہ فرطِ جذبات سے بول رہا تھا۔ وہ شاید خوشی سے رو بھی رہا تھا۔ اور اس روز کے بعد سے میرال کی تمام دعاؤں کا مرکز صرف وہی ایک شخص بن کر رہ گیا تھا۔ وہ کینیڈا جا کر بھی اس سے کانٹیکٹ

میں رہا تھا۔ بلکہ وہ تو ارتضیٰ اور روحان سے بھی کانٹیکٹ میں رہا تھا۔ یہ ایمان ہی تھی جسے اپنے گھر سے کسی بھی لڑکے سے بات کرنے کی اجازت نہیں تھی۔۔۔ سو اس سے اس کا کانٹیکٹ بالکل کٹ کر رہ گیا تھا۔ اسے وہ کبھی کبھار یاد آیا کرتا بھی تو وہ ارتضیٰ سے اس کا حال احوال پوچھ لیا کرتی تھی۔

"ایمان؟ کہاں کھو گئی؟"، میرال کے پوچھنے پر وہ جیسے ماضی سے واپس آئی تھی۔ سر جھٹک کر ہلکا سا مسکرائی تھی۔

"کہیں نہیں۔۔۔ بس تم سناؤ۔۔۔ بات ہوتی رہتی ہوگی تمہاری تو کاکا سے۔۔۔ واپس آنے کا ارادہ کب ہے اس کا؟"، اس نے ایک ہاتھ سے موبائل کان سے لگائے دوسرے ہاتھ کی انگلی میں اپنے کھلے بالوں کی لٹ لپیٹتے ہوئے پوچھا تھا۔ میرال ایک بار پھر مسکرائی تھی۔

"انشاءاللہ اگلے ماہ آنے کا ارادہ ہے۔ نکاح ہے ناں اگلے ماہ ہمارا۔"، میرال کے بتانے پر ایمان خاصی بے یقینی سے پلنگ پر ایک جھٹکے سے اٹھ بیٹھی تھی۔ لب مسکراہٹ میں ڈھلتے چلے گئے تھے۔

"تم۔۔۔ تم سچ کہہ رہی ہو، میرو؟ کیا واقعی؟"، وہ جتنا حیران ہوتی اتنا کم تھا۔ میرال بھی کھلکھلا دی تھی۔

"ہاں تو اور کیا۔۔۔ یہی بتانے کے لیے تو کال کی ہے تمہیں۔۔۔ جانتی ہو؟ مجھے تمہیں ان ڈھائی سالوں کی پوری روداد سنانی ہے۔۔۔ اف مونی، میں بتا نہیں سکتی کہ میں نے تمہیں کتنا مس کیا ہے۔۔۔"، وہ آنکھیں میچے خوشی اور ایکسائٹمنٹ سے بول رہی تھی اور ایمان خوشی سے مسکراتی جا رہی تھی۔ وہ واقعی ان دونوں کے لیے بہت خوش تھی۔

"اور تم بھی مجھے سناؤ گی اپنی آپ بیتی کہ کیسے تم یہاں پہنچی؟ کب پہنچی؟ کیوں پہنچی؟ سب کچھ۔۔۔"، وہ اگلی جانب سے بولی تو ایمان نے مدھم سے انداز میں سر اثبات میں ہلا دیا۔

"اوکے۔۔۔ڈن۔"

اللہ حافظ کہہ کر وہ یونہی موبائل یوز کرنے لگی تھی۔ میسجز کے ایپلیکیشن میں ہری بتی کے اندر دو کا ہندسہ بنا ہوا تھا۔ اس نے کلک کیا تو ایک پیج لوڈ ہو گیا۔ سب سے اوپر کسی غیر شناسا نمبر سے دو میسجز موصول ہوئے ہوئے تھے۔ چیٹ پر کلک کیا تو ایک قطار میں آئے دونوں میسجز اس کی نگاہوں کے سامنے آئے۔

"ہیلو ایمان۔"

"ہیپی برتھ ڈے ٹو یو۔"

www.novelsclubb.com

یہ میسجز اسے صبح کے آٹھ بجے موصول ہوئے تھے مگر مصروفیات کے باعث دھیان ان کی جانب نہ گیا تھا۔ اب جب اس نے میسجز پڑھے تو کئی لمحات تک نا سمجھی لیے انہیں تکے گئی۔

کس نے کیے تھے یہ میسجز؟

"آپ کون؟"، چند لمحوں بعد اس نے ٹائپ کر کے میسج بھیج دیا اور کنفیوژن میں گھرے موبائل آف کر دیا۔

***

غزل کو گھر آئے آج دو دن ہو گئے تھے۔ ارشد صاحب کا روز کا آنا جانا تھا، البتہ وہ وہاں رکے نہیں تھے۔ گھر میں ان کی بیٹی کے علاوہ بھی دو جوان لڑکیاں موجود تھیں، ایسے میں یوں رکنا انہیں کسی طور مناسب نہیں لگ رہا تھا۔

ابھی انہیں گئے کچھ ہی دیر ہوئی تھی۔ غزل اپنے کمرے میں پلنگ پر تکیوں کے سہارے نیم دراز تھی۔ اس کا چہرہ طمانیت سے دمک رہا تھا۔ سادہ سے شلوار قمیض میں ملبوس، دوپٹہ گلے میں ڈالے وہ آنکھیں موندے ہوئی تھی۔ سیاہ بال گول مول کر کے ایک ڈھیلے سے جوڑے میں مقید تھے۔ اس سے کچھ ہی فاصلے پر ایمان بیٹھی سر جھکائے کوئی کتاب پڑھ رہی تھی۔

www.novelsclubb.com

ارحہ کو ثمرین اپنے کمرے میں لے کر گئی ہوئی تھی تا کہ غزل کچھ آرام کر لے۔ کھڑکی کے آگے گرے قد آدم پردوں کے پار سے مغرب کا جامنی سا اندھیرا نظر آرہا تھا۔ جبھی ایمان نے یکدم ہی سر اٹھا کر غزل کو دیکھا تھا۔

"غزل۔ "اس کے پکارنے پر غزل نے یونہی اسی پوزیشن میں لیٹے آنکھیں کھول کر اسے دیکھا تھا۔

"ایک بات پوچھوں آپ سے؟"، غزل کے سر ہلا کر اجازت دینے پر وہ ذرا سا قریب آئی تھی۔

"ایمان اور اسلام میں کیا فرق ہوتا ہے، غزل؟"، غزل چند لمحات اسے نرمی سے دیکھے گئی تھی، پھر مسکرا کر ایک ہاتھ پہ زور دیئے کچھ سیدھی ہوئی تھی۔

"جانتی ہو؟ ایک اور انسان نے بھی ایک بار مجھ سے یہ سوال کیا تھا۔ میں آج تمہیں بھی وہی جواب دیتی ہوں جو تب اسے دیا تھا۔ "، ایمان آلتی پالتی مارے بیٹھی، گھٹنے پر اپنی کہنی ٹکائے،

چہرہ ہتھیلی کے پیالے میں ڈالے،اسے دلچسپی سے دیکھ رہی تھی۔ آنکھوں میں سب کچھ جان لینے کا تجس تھا۔

"اسلام۔۔۔زندگی گزارنے کا وہ طریقہ جو اللہ تعالیٰ نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بتایا اور انہوں نے پھر ہمیں بتایا۔ نماز پڑھو، قرآن پر عمل کرو،روزے رکھو،حج کرو، صبر کرو، شکر کرو، زکوۃ دو، لڑو مت، تکبر نہ کرو، فساد نہ کرو۔۔۔یہ سب اور ان جیسی مزید چیزیں ہماری زندگی کا وہ طریقہ ہیں جو افضل ترین ہے۔ اللہ عزوجل کا بتایا ہوا طریقہ ہے یہ اور اسے اسلام کا نام دیا گیا ہے۔۔۔جبکہ ایمان۔۔۔اس کا تعلق تو دل سے ہے۔ دل کا کسی چیز پر یقین لانا ایمان کہلاتا ہے۔ ہم اللہ کے واحد و یکتا ہونے پر، قادر و مطلق ہونے پر،حاضر و ناظر ہونے پر، مالک و رازق ہونے پر یقین رکھتے ہیں۔ اس کی صفات پر،اس کی ذات پر یقین رکھتے ہیں۔ اور اسی یقین کو ایمان کا نام دیا گیا ہے۔ اللہ پر،اس کے فرشتوں، پیغمبروں، کتابوں پر،اچھی اور بری تقدیر پر، آخرت کے دن پر اور آخرت کے بعد کی دائمی زندگی پر یقین رکھنا ایمان کے

تقاضے ہیں۔ کسی ایک پر ایمان نہ رکھنے سے ایمان نامکمل ہو جاتا ہے۔"، غزل نے جب تک بات مکمل کی، ایمان کے چہرے کا رنگ پھیکا پڑ گیا تھا۔ آنکھوں کی جوت بجھ گئی تھی۔

"اچھی اور بری تقدیر پر ایمان رکھنے سے کیا مراد ہے؟"

نجانے کیوں اس کو اپنے حلق کے گرد کانٹے چبھتے محسوس ہوئے تھے۔

"جانتی ہو قدر کسے کہتے ہیں؟"، غزل نے دھیمے لہجے میں اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا تو اس نے سر نفی میں ہلا دیا۔

"قدر مطلب تقدیر۔ وہ نصیب اور قسمت جو اللہ نے ہمارے لیے لکھ دی ہے، جو کبھی بھی بدل نہیں سکتی۔ جانتی ہو ہم اکثر سنتے ہیں کہ دعا کرو۔ دعا تقدیر بدلنے پر قادر ہے۔ مگر مجھے نہیں لگتا کہ ایسا ہوتا ہے۔ میرے خیال میں اللہ نے لوح محفوظ میں جو لکھ دیا، سو لکھ دیا۔ وہ بدل نہیں سکتا۔ اللہ کا لکھا ہر حرف کائنات پر نقش ہے۔ جو ہوتا ہے، جو ہو چکا ہے اور جو ہونا ہے، وہ ویسے ہی ہونا ہے جیسے لکھا ہے۔ اللہ عظیم ہے۔ اس کا کہا ہر حرف سچ۔ وہ اپنی بات سے نہیں

www.novelsclubb.com

پھرتا۔ ہم اکثر سوچتے ہیں کہ ہم نے دعا کی تو یہ ہو گیا،وہ ہو گیا۔ مگر جو ہوا،اس کا ہونا ایسے ہی لکھا تھا۔ ہماری دعائیں قبول ہوتی ہیں۔ میں یہ نہیں کہہ رہی کہ دعا کرنا فضول ہے۔ مگر جو دعا کے ذریعے ہوا،اس کا پہلے ہی دعا کے ذریعے ہونا لکھ دیا گیا تھا۔"،ایمان کے چہرے پر سنجیدگی چھائی تھی۔ آنکھوں کا تجسس گھلنے لگا تھا۔اس نے اس طریقے سے نہ کبھی سوچا تھا،نہ سنا تھا۔ دماغ کے سوالوں کی فہرست میں سے ایک کا جواب مل گیا تھا۔ ابھی اور بھی باقی تھے۔

"تو پھر ہم دعا کیوں کریں؟ سب کچھ تو مقدور ہے۔"،اور اس سوال پر غزل ہلکا سا کھلکھلائی تھی۔

"ہمیں کچھ چاہیئے ہوتا ہے تو ہم کوشش تو کرتے ہیں ناں اسے حاصل کرنے کی؟"،ایمان نے سر اثبات میں ہلایا تو غزل مسکرادی۔"دعا بھی کوشش ہے،ایمان۔"

اور ایمان زاویار کی نم آنکھوں میں سرخی سی ابھری تھی۔اس نہج پر سوچنا اسے نئے مطلب دے رہا تھا۔ نئی پہیلیاں بوجھا رہا تھا۔

"ایک مثال کے طور پر، اللہ کا حکم ہے کہ چھپے دوست نہ بناؤ۔ حرام تعلق میں نہ پڑو۔ اللہ کے سوا کسی کو رازداں نہ بناؤ۔ یہ دور فتنے کا دور ہے۔ اس دور میں خود کو بچا کر رکھنا کٹھن ہے۔ لڑکے لڑکیاں ان خرافات میں پڑ جاتے ہیں۔ مگر جو نہیں پڑتا، اس کا ایمان مضبوط ہے۔ یقین ہے اسے کہ اس کی اس تابعداری کے بدلے اس کا اجر بڑا ہو گا۔"، ایمان کو لگا تھا کہ وہ اسے ملامت کر رہی ہے۔ اسے آج تک ارتضیٰ مراد سے باتیں کرنا، چھپ کر اس سے ملنا، اس کے سامنے آنسو بہانا اور اس کے لیے آنسو بہانا کبھی نہیں کھٹکا تھا۔ مگر آج کچھ برا الگ رہا تھا۔ بہت۔۔۔ بہت برا الگ رہا تھا۔

"جانتی ہو، ایمان؟ محبت پر انسان کا اختیار نہیں ہوتا۔ محبت ہونی ہوتی ہے تو ہو جاتی ہے۔ مگر یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ ہر ایٹریکشن محبت نہیں ہوتی۔ ہر آبسیشن بھی محبت نہیں ہوتی۔ محبت تو بہت پاک ہوتی ہے، ایمان۔ جس میں حاصل یا لاحاصل ہونا معنی نہیں رکھتا۔ محبوب حاصل رہے یا لاحاصل، محبت ختم نہیں ہوتی۔ صرف ایک ایسی محبت ہوتی ہے جس میں حصول

ہی سب کچھ ہوتا ہے۔۔۔"،اور ایمان کے دل کی دھڑکنوں نے رفتار پکڑی تھی۔"اور وہ محبت رب کی محبت ہوتی ہے۔انسان اللہ سے محبت کرتا ہو تو خود کو سرتاپا ویسے ڈھالنے کی تگ ودو کرتا ہے جیسا اللہ چاہے۔اور خود کو اس سانچے میں ڈھالنے میں خوب دقت ہوتی ہے، مگر ایک بار انسان اس سانچے میں ڈھل جائے تو ہر تکلیف بے جان ہوتی معلوم ہوتی ہے۔"

ایمان اسے نم پڑتی آنکھوں سے دیکھے گئی تھی۔اس نے آج تک اللہ سے محبت کی ہی کب تھی؟وہ تو شاید اپنی تکلیفیں کم کرنے کا ایک طریقہ تھا جو وہ روز اللہ کے سامنے اشک بہایا کرتی تھی۔تبھی تو اس سے رب کی رسی چھوٹ گئی تھی۔محبت انس کے بجائے رب سے ہو تو اللہ کی رسی کبھی نہیں چھوٹتی۔

www.novelsclubb.com

***

تاروں سے بھرے آسمان پر چاند آج کہیں نہیں دکھتا تھا۔پاکستان کے برعکس یہاں کا موسم کافی ٹھنڈا،تازگی بخش تھا۔رات کی تاریکی میں بھی ایک منفرد سی تازگی تھی۔ کینیڈا یوں بھی ایک ٹھنڈا ملک ہی ہے سو یہاں کی ٹھنڈک کا عالم وہی تھا جو ہوا کرتا تھا۔

منظر ایک جدید طرز پہ بنے ریسٹورنٹ کا ہے جہاں ایک کونے کی میز پر ایک لڑکا سر جھکائے بیٹھا تھا۔اس کی انگلیاں میز پر پڑے اپنے موبائل پر رقصاں تھیں۔ چہرہ جھکانے کے باعث اس کی شکل تو نظر نہیں آرہی تھی البتہ اس کے ماتھے پر بکھرے بال،چہرے کے آگے رکھا سفید ہاتھ اور لباس اسے کافی ایستھیٹک سا لک دے رہا تھا۔وہ یوں اس پوزیشن میں بیٹھا آس پاس بیٹھے بہت سے لوگوں کو خود کی جانب متوجہ کر رہا تھا۔

وہ لوگوں سے ملنے والی ستائش سے واقف تھا،مگر لاپرواہی سے موبائل کی جانب متوجہ تھا۔ جبھی موبائل پر ایک نمبر جگمگایا تو وہ سیدھا ہو بیٹھا۔ سیدھا ہونے سے اس کا چہرہ واضح ہوا تھا۔اس کا چہرہ بھی اس کے ہاتھوں ہی کی طرح سفید سا تھا۔ آنکھیں سیاہ،گول سی،بڑی بڑی،نہایت پرکشش

www.novelsclubb.com

سی تھیں۔ چہرے کے خدوخال کھڑے کھڑے تھے۔ سیاہ شرٹ پر لیدر کا جیکٹ پہنے، جینز میں ملبوس، چوڑے تند شانوں والا وہ نوجوان کسی مجسمے جیسا لگتا تھا۔

اس نے کال پک کر فون کان سے لگایا تھا۔

"ہاں ہیلو۔"، اس کی آواز نہایت بھاری اور ٹھہری ہوئی تھی۔ لب و لہجہ کینیڈین تھا۔ مگر لہجے میں کہیں کہیں پاکستانی عنصر بھی شامل تھا۔

"ہاں میں اندر ہی ہوں۔ تو پہنچ گیا؟"، اس نے پوچھنے کے بعد اگلی جانب سے کچھ سنتے ہی گردن اٹھا کر، سامنے ریسٹورنٹ کے بڑے سے شیشے کے دروازے کے پار نظر آتے پارکنگ لاٹ کی جانب دیکھا تھا جہاں ابھی ابھی ایک گاڑی آکر رکی تھی۔ اگلے ہی پل وہ موبائل جیکٹ کی جیب میں اڑستا اٹھ کر باہر کی جانب بڑھا تھا۔ اس کے قدموں کی رفتار تیز تھی۔ کچھ دیر پہلے تک جس چہرے پر محض سنجیدگی تھی، اب وہاں ایک بہت ہی پیاری سی مسکراہٹ رقصاں تھی۔

www.novelsclubb.com

ریسٹورینٹ کا شیشے کا دروازہ پار کرتے ہی وہ ہلکا ہلکا دوڑتا گاڑی تک پہنچا تھا جس کی ڈرائیونگ سیٹ کا دروازہ کھولے حسنہ باہر نکلی تھی۔ بھورے رنگ کی گھٹنوں سے کافی نیچے تک آتی فراک کے نیچے اس نے چست جینز پہن رکھی تھیں جو ہلکی سی ہی نظر آرہی تھیں۔ چہرے کے گرد بھورا اسٹالر لپیٹے وہ اسے دیکھ کر مسکرائی تھی۔ وہ بھی جواباً مسکرا کر سر کو خم دیتا سلام کر رہا تھا۔

"السلام علیکم۔"

"وعلیکم السلام۔"، حسنہ نے بھی مسکرا کر جواب دیا تو وہ مسکرا کر سر ہلاتا پیسنجر سیٹ کی جانب بڑھ گیا۔ پیسنجر سیٹ کا دروازہ کھول کر روحان نے اپنی واکنگ اسٹک باہر رکھی تھی۔ اسے دیکھتے ہی روحان کے چہرے پر زندگی سے بھرپور مسکراہٹ دوڑ گئی تھی۔ اس نے جلدی سے آگے بڑھ کر روحان کو شانے سے تھامے سہارا دیا تھا۔ اب وہ نہایت خوشی سے اس کے گلے لگا اس کی پشت تھپک رہا تھا۔

"کیسے ہو ہیرو؟"،روحان نے بھی اس کی پشت سہلاتے مسکرا کر پوچھا تھا۔ جواباً اس نے روحان کو پیچھے کرتے ایک بار پھر شانے سے پکڑ کر سہارا دیا تھا۔

"تفصیل سے بتاؤں گا کہ کیسا ہوں۔"،ان کی آوازیں اندر جاتے جاتے مدھم ہوتی جارہی تھیں۔ حسنہ بھی ان کے پیچھے پیچھے ہی اندر بڑھی تھی۔

کچھ دیر بعد وہ تینوں اسی میز کے گرد بیٹھے تھے۔ میز پر گرما گرم کھانا پڑا تھا۔ میز کی ایک طرف حسنہ بیٹھی تھی جبکہ دوسری طرف وہ دونوں ایک دوسرے کے برابر میں بیٹھے تھے۔ دونوں ایک دوسرے کو دیکھتے گفتگو کرنے میں مگن تھے۔ کامل اس سے ایک ایک کر کے سب کا حال احوال پوچھ رہا تھا جس کا جواب روحان بہت تفصیل سے دے رہا تھا۔ حسنہ اپنی پلیٹ میں کھانا ڈالتے ہوئے مسکرا کر اسے سن رہی تھی۔ اس نے بہت وقت بعد روحان کو اتنا خوش و خرم دیکھا تھا۔ گزرے دنوں میں تو اس کی ہنسی جیسے غائب ہی ہو گئی تھی۔ آج اتنے دنوں بعد اس کو یوں دیکھ کر اس کے اندر جیسے اطمینان سا پھیل گیا تھا۔

کامل باری باری سب کی خیریت پوچھ رہا تھا۔ یوں تو اس کا رضا، روحان اور میرال سے رابطہ تھا، مگر پھر بھی وہ سب کے بارے میں ہی پوچھ رہا تھا۔

"رضا کیسا ہے؟"

"ٹھیک ہے الحمدللہ۔ لندن میں ہے ناں اب تو۔"، اس کے کہنے پر کامل نے سر ہلایا تھا۔

"آہاں۔۔۔ معلوم ہے۔ ہوئی تھی میری بات اس سے لندن جانے کے بعد۔"

"اور مونی کے حال تو سناؤ۔"، اب کے کامل نے فرصت سے ہتھیلی ٹھوڑی تلے ٹکا کر اس سے پوچھا تو روحان اور حسنہ نے بے اختیار ایک دوسرے کو دیکھا تھا۔ پھر روحان نے ایک گہرا سانس فضا کے سپرد کیا تھا۔

"کیا ہی بتاؤں میں اس کے حال! بس زندہ ہے وہ۔"، روحان کے کہنے پر جہاں حسنہ نے افسوس سے سر جھٹکا تھا، وہیں کامل کے ماتھے پر ناسمجھی کے شکن نمایاں ہوئے تھے۔

novelsclubb@gmail
www.novelsclubb.com
IG: @novelsclubb

"کیا مطلب ہے تمہارا؟"، وہ سیدھا ہو بیٹھا تھا۔ روحان کچھ نہ بولا تو اس نے چہرہ موڑ کر حسنہ کو سوالیہ نگاہوں سے دیکھا تھا۔ اس نے ایک سانس لے کر اس کو دیکھا تھا۔

پھر اس نے آہستہ آہستہ کر کے بتانا شروع کیا تھا۔۔۔ کامل کے چہرے پر کئی رنگ آ کر گزر گئے۔ نہایت بے یقینی سے کھانا بھولے وہ اسے سنتا جا رہا تھا۔ وہ خاموش ہوئی تو سارے میں ایک سناٹا سا چھا گیا۔ روحان چہرہ جھکائے پلیٹ میں فورک گھما رہا تھا۔ حسنہ افسردگی سے اپنی انگلیاں مروڑ رہی تھی جبکہ کامل شل سا بیٹھا تھا۔ آس پاس ہر چیز گویا غائب ہو گئی تھی۔ وہ تینوں ساکت سے ایک دوسرے کی جانب متوجہ تھے۔

"اتنا کچھ ہو گیا اور مجھے کسی نے بتایا تک نہیں؟"، کچھ پلوں بعد کامل بہت ہی افسوس سے بولا تو روحان نے چہرہ اٹھا کر اسے دیکھا۔

"سب کی زندگی مشکل ہے، کاکا۔ سب اپنے اپنے حصے کی مشکلات جھیل رہے ہیں۔ میں اپنے حصے کی، تم اپنے حصے کی، رضا اپنے حصے کی، مونی اپنے حصے کی، میرو اپنے حصے کی۔۔۔ زندگی

کسی کے لیے بھی آسان نہیں۔ ہم سب ایک دوسرے کے لیے پریشان ہیں مگر ایک دوسرے کے لیے کچھ بھی کرنے کی استطاعت نہیں رکھتے۔"اس نے ایک ٹھنڈی آہ بھر کر نہایت بے بسی کے عالم میں کہا تھا۔اس کی بات پر کامل نے سر نفی میں ہلایا تھا۔ پھر چند لمحات بعد کچھ سوچ کر اس نے روحان کو دیکھا تھا۔

"تمہارے پاس اس کا کانٹیکٹ نمبر ہے تو مُجھے دو۔"اس کے کہنے پر روحان نے نفی میں سر ہلایا تھا۔

"اس کے پاس فون نہیں ہے۔ جو تھا،اس پر بعد میں کال نہیں لگ رہی تھی۔ میں نے ٹرائی کی تھی۔"،کامل نے پریشانی کے عالم میں ایک گہرا سانس لیا تھا۔ان کے سامنے پڑا کھانا اب پوری طرح سے ٹھنڈا ہو چکا تھا۔ کھانے کی خوشبو ہوا میں تحلیل ہو کر رہ گئی تھی۔

"تم پھر بھی مجھے اس کا نمبر سینڈ کر دو۔"،اس نے کہا تو روحان نے سمجھ کر سر ہلا دیا۔

www.novelsclubb.com

"اور تم سناؤ۔پاکستان واپسی کب ہے تمہاری؟"،روحان نے پوچھا تو اب کے کامل ہلکا سا مسکرایا۔

"اگلے مہینے،انشاءاللہ۔ پھر کچھ ہی دن بعد نکاح۔"،اس کے چہرے پر ایک عجیب سی طمانیت جھلکتی تھی۔روحان نے مسکرا کر اس کی پشت تھپتھپائی تھی۔

"مبارک سائیں۔"،مسکرا کر کہا تو وہ ہلکا سا ہنس دیا۔

"خیر مبارک جناب۔"

باہر رات قطرہ قطرہ بیت رہی تھی۔وقت بیتنے کے ساتھ ساتھ ٹھنڈ میں بھی اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔

www.novelsclubb.com

٭٭٭

وہ جب تک اپنے اپارٹمنٹ پہنچے،رات کافی گہری ہو چکی تھی۔ خنکی میں از حد اضافہ ہو چکا تھا۔ ان کا اپارٹمنٹ ایک پانچ منزلہ عمارت کے نچلے فلور پر واقع تھا۔یہ چھوٹا سا ایک کمرے پر مشتمل اپارٹمنٹ تھا۔داخلی دروازے کے عین سامنے چھوٹا سا لاؤنج تھا جس میں دیوار کے ساتھ

ایک ڈبل صوفہ رکھا تھا۔ صوفے کے مقابل دیوار پر ایل سی ڈی لگا تھا۔ صوفوں کے پار، داخلی دروازے کے عین مقابل بالکونی کا دروازہ تھا جو فی الوقت بڑھتی سردی کے باعث لاکڈ تھا۔

لاؤنج کی دیوار کے بعد اوپن کچن تھا اور کچن کے ساتھ ہی دو دروازے موجود تھے۔ داہنی جانب والا دروازہ بیڈ روم کا تھا جبکہ بائیں سائیڈ پر واش روم موجود تھا۔ یہ ایک چھوٹا مگر نفیس سا گھر تھا۔ حسنہ وہیل چیئر گھسیٹتی لاؤنج میں لائی تھی اور پھر صوفے کے پاس روک کر سوئچ بورڈ کی جانب بڑھی تھی۔ لائٹ آن کر کے اب وہ گلے کے گرد لپٹا اسٹالر اتار رہی تھی۔ ایک نظر روحان کے چہرے پر بھی ڈالی۔ وہ اسے کافی مضطرب سا لگا تھا۔

"خیریت ہے؟"،اس کے قریب صوفے پر بیٹھتے ہوئے اس نے دھیرے سے پوچھا تو روحان نے اسے چہرہ موڑ کر دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں نمی سی جھلملائی تھی۔ ایک پل کو لب بھینچ کر اس نے جیسے خود پر ضبط کیا تھا اور پھر بمشکل ہلکا سا مسکرایا تھا۔

"میرے سارے دوستوں کے ساتھ اتنی ٹریجڈیز کیوں ہیں، حسنہ؟ کوئی بھی اپنی زندگی میں مطمئن کیوں نہیں ہے؟"، وہ جیسے بہت دل گرفتگی سے پوچھ رہا تھا۔ اور اس کی اس بات پر حسنہ اس سے زیادہ دل گرفتہ ہوئی تھی۔ وہ کبھی کبھی سوچتی تھی کہ وہ روحان یامین کو سمجھتی ہے۔ مگر پھر اسی پل روحان اس پر یہ آشکار کر دیا کرتا تھا کہ وہ اب بھی اس کو سمجھنے کے معاملے میں کچی ہے۔

وہ اپاہج تھا۔ معذور تھا۔ محتاج ہوا پڑا تھا۔ مگر اس کی سوچوں کا بھنور آج بھی اپنے دوستوں کے گرد گھوم رہا تھا۔ کبھی کبھی تو اسے لگنے لگتا کہ شاید روحان کی زندگی میں اس سے پہلے اس کے دوست آتے ہیں۔ اپنا آپ بے وقعت لگتا مگر پھر۔۔۔

پھر وہ اسے بھی باور کروادیا کرتا تھا کہ وہ اہم تھی۔ وہ نہ ہوتی تو شاید روحان بھی نہ ہوتا۔ اگر روحان اس کی کل کائنات تھا تو حسنہ بھی اس کی زندگی تھی۔ اس کا سہارا تھی۔ روحان یامین اسے ہر بار نئے طریقے سے حیران کیا کرتا تھا۔

www.novelsclubb.com

"تمہارے دوست انسان ہیں ناں، روحان۔ اور مشکلات انسانوں کے حصوں میں ہی تو آیا کرتی ہیں ناں۔"، اس نے نرمی سے کہتے ہوئے اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھا تھا۔ پھر ہاتھ بڑھا کر اس کی جھلملاتی آنکھوں کو اپنے ہاتھوں سے صاف کیا۔

"مشکلات زندگی نہیں ہوتیں، روحان۔ زندگی کا ایک حصہ ہوتی ہیں بس۔ ان کو زیادہ سر پر سوار نہ کرو۔ دیکھنا ایک وقت آئے گا جب ہر چیز صحیح ہو جائے گی۔ تمہیں بس اس وقت تک ہمت کرنی ہے۔ ہوں؟"، آخر میں وہ مسکرائی تو روحان نے ایک نم سانس خارج کر کے سر اثبات میں ہلا دیا۔ پھر ممنون آنکھوں سے اسے دیکھا۔

"تمہیں خالہ کی بات مان لینی چاہیے تھی، حسنہ۔ فضول میں میرے پیچھے اپنی زندگی داؤ پر لگا رہی ہو۔"، اب کے کہتے ہوئے اس نے شرمندگی سے سر جھکا لیا تھا۔ جیسے وہ اپنی اس معذوری پر جی بھر کر نادم ہو۔ اس سارے وقت میں حسنہ نے پہلی بار خود پر شدید ضبط کیا تھا۔

"پھر بکواس کی؟"

روحان نے دھیرے سے سر اٹھا کر اسے دیکھا تھا۔ اس کی آنکھ سے ایک آنسو ٹپکا تھا۔ چہرہ اہانت سے سرخ پڑ رہا تھا۔ وہ جیسے اپنی ذات پر ہی شرمندگی کا شکار ہو رہا تھا۔

"بکواس نہیں ہے یہ، حسنہ۔ سچ ہے۔"

"سچ نہیں، بکواس کہتے ہیں اسے۔ اب اگر تم نے ایک بار اور ایسی کوئی بات کی تو میں بتا رہی ہوں، اچھی بات نہیں ہوگی۔"، وہ انگلی اٹھا کر اسے وارن کرنے والے انداز میں بولی تھی۔ روحان کچھ بول نہ سکا تھا۔ بس جھلملاتی آنکھیں لیے اسے تکے گیا تھا۔ کچھ دیر مزید سرکی تو اس نے ایک ٹھنڈا سانس بھرا۔

"ایمان نجانے کہاں ہوگی۔ خیریت سے ہوگی بھی یا نہیں۔"، اس نے بے دلی سے کہتے ہوئے حسنہ کو دیکھا تھا جو اب بالکل خاموش نظروں سے اسے ہی تک رہی تھی۔ کچھ توقف کے بعد اس نے اپنے بیگ میں سے روحان کا نیا فون نکالا تھا اور پھر اس کی جانب بڑھایا تھا۔ پرانا فون ایکسیڈینٹ کے وقت ہی ٹوٹ گیا تھا اور اس کی پرانی سم بھی ڈیمج ہو گئی تھی۔

"لو۔ کال کر کے پوچھ لو خیریت۔"، اس نے آرام سے کہا تو روحان کچھ حیران ہوا۔ وہ یقین نہ کر سکا کہ یہ وہی حسنہ تھی جو ایمان سے اس قدر چڑ گئی تھی کہ اس کا نام تک سننا پسند نہیں کرتی تھی، کجا یہ کہ آج اتنے دنوں بعد وہ خود اسے ایمان کو کال کرنے کا مشورہ دے رہی تھی۔

"آر یو شیور؟"، روحان نے سر ہلکا سا جھکائے محتاط سے انداز میں پوچھا تو حسنہ کے لب ایک جانب سے اوپر کو اٹھے۔ اس نے مسکرا کر سر اثبات میں ہلایا تھا۔

"یس۔ آئی ایم۔"

روحان کے چہرے پر بھی ایک مسکراہٹ نمودار ہوئی تھی۔ اس نے جلدی سے فون میں ایمان کا نمبر ڈائل کیا تھا۔ اس نے ایمان کا نمبر ایکسیڈنٹ والی رات ہی یاد کیا تھا، جسٹ ان کیس کے تحت۔

www.novelsclubb.com

کافی دیر تک گھنٹی جاتی رہی مگر کسی نے کال پک نہ کی۔ ایکسیڈنٹ کے بعد بھی دوبارہ وہ ایمان کو کال کرنے کی کوشش کرتا رہا تھا مگر دونوں بار نمبر بند جاتا۔ آج خلافِ توقع اگلی جانب گھنٹی جاتی سنائی دے رہی تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ اس کا نمبر آن ہو چکا تھا۔

جب کافی دیر تک کسی نے کالز پک نہ کیں تو اس نے چار و ناچار موبائل حسنہ کی جانب بڑھا دیا۔ حسنہ نے "اب میں کیا کر سکتی ہوں؟" والے انداز میں شانے اچکائے تھے۔

باہر ہر گزرتے لمحے کے ساتھ رات گہری ہوتی جا رہی تھی۔ ٹھنڈ اور خنکی میں از حد اضافہ ہو چکا تھا۔

www.novelsclubb.com

***

کراچی میں آج دھوپ خوب چمکی تھی۔ خزاں کی آمد آمد تھی سو موسم اور ہوا میں عجیب سی کھچاؤ والی خشکی رچی بسی تھی۔ ہر ایک شے دھوپ کی زردی مائل سی روشنی میں نہائی محسوس ہو

رہی تھی۔ آج ایمان کا یونیورسٹی میں پہلا دن تھا۔ یوں تو ثمرین کا بھی آج پہلا دن ہی تھا مگر اس نے چھٹی کرنے کو ترجیح دیتے ہوئے گھر پر آرام کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔

سو دن چڑھے، جب سورج سوا نیزے پر تھا، وہ یونیورسٹی کے کیفٹ ایریا میں آ بیٹھی تھی۔ کیفٹ ایریا کے شیڈ تلے وہ ایک میز کے گرد اکیلی بیٹھی تھی۔ اس کی آج پہلی تین گھنٹے کی کلاس ہو چکی تھی۔ اب دو گھنٹے کا بریک ہونے کے بعد ایک اور کلاس تھی اور پھر گھر واپسی۔

سادہ سے سبز رنگ کے کرتا شلوار پہنے، کپڑوں کا ہم رنگ دوپٹہ سر اور شانوں پہ پھیلائے، وہ پیاری لگ رہی تھی۔ چہرے پر ایک منفرد سی تازگی نظر آتی تھی۔ اس کے سامنے میز پر پیپر پلیٹ پر ایک سینڈوچ رکھا تھا جس سے وہ ہر کچھ لمحے بعد لقمہ لیتی تھی۔ نگاہیں یونہی ادھر ادھر پھر رہی تھیں جب اس کو سامنے سے ایک لڑکی چلتی ہوئی نظر آئی تھی۔ سادہ سی کرتی کے ساتھ کھلی سی جینز زیب تن کیے، سر کے گرد سیاہ رنگ کا دوپٹہ رف سے انداز میں لپیٹے، وہ نہایت لا

ابالی سے انداز میں چلتی ہوئی کیفٹ ایریا میں داخل ہوئی تھی۔ہاتھ پہلو میں لہراتی وہ سیدھی کینٹین کی جانب بڑھی تھی۔ایمان لاشعوری طور پر اسے دیکھے گئی تھی۔

اب وہ مڑ کر ہاتھ میں ایک پیپر پلیٹ تھامے ایک میز تک گئی تھی اور میز پر پلیٹ کے ساتھ اپنا بیگ رکھتی، سر پر ہاتھ مارتی واپس کینٹین کی جانب دوڑی تھی۔اس کے کینٹین کی جانب بڑھتے ہی چند میزیں چھوڑ کر بیٹھے دو لڑکے اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔اب وہ آرام آرام سے دبے قدموں چلتے اسی میز تک پہنچنے تھے۔پھر دھیرے سے اس کی پلیٹ میں پڑے دو سموسے اٹھائے تھے اور اس سے پہلے کہ وہ دونوں سموسے ان کے منہوں کو لگتے، کسی نے انہیں پیچھے سے گدی سے پکڑا تھا۔

"اے۔مرنا ہے کیا تم دونوں کو؟"وہ ان کو اب بالوں سے پکڑے غرا رہی تھی۔وہ دونوں ہی درد سے بلبلائے تھے۔اس کی گرفت بہت مضبوط تھی،ایمان دور سے ہی محسوس کر سکتی تھی۔

www.novelsclubb.com

"آہ۔۔۔سوری سوری۔"،وہ دونوں اپنے بال چھڑانے کی تگ ودو میں ہلکان ہوئے جا رہے تھے جبکہ گرفت تھی کہ ہر لمحے کے ساتھ ساتھ مضبوط ہوتی جا رہی تھی۔ ایمان کو اس منظر کو دیکھ کر بے ساختہ ہی پیٹ میں گدگدی ہوئی تھی۔ ایک ہلکا سا قہقہہ بھی اس کے منہ سے نکلا تھا۔ کیفٹ ایریا میں موجود اکا دکا لوگ بھی ان ہی کی طرف متوجہ ہو گئے تھے۔

آخر کار اس لڑکی کی گرفت تھوڑی ہلکی ہوئی تو وہ دونوں لڑکے پتلی گلی پکڑ کر بھاگے۔ اب وہ غصے سے بڑبڑاتی، سر جھٹکتی کرسی کھینچ کر بیٹھ گئی تھی۔ آس پاس سارے ہنستے ہوئے لوگ اپنے اپنے کاموں میں جت گئے تھے۔

محض ایمان ہی تھی جو پر شوق انداز میں آنکھیں گول کیے اسے تک رہی تھی۔ سینڈ وچ اٹھا کر اس کا نوالہ لیتے ہوئے بھی اس کی نظریں اسی لڑکی پر جمی تھیں۔ کیسی دبنگ لڑکی تھی ناں یہ! ہائے کاش وہ بھی اس کی جیسی ہی ہوتی۔ کاش!

گہری بھوری رنگ کی آنکھیں، دوپٹے کی اوٹ سے جھانکتے گہرے بھورے بال، گندمی رنگت کا حامل شفاف چہرہ، اور اس چہرے پہ سجا سیاہ فریم والا چشمہ۔۔۔وہ تقریباً ایمان کی ہی عمر کی لگتی تھی۔ چہرے پر دنیا جہاں کی بے نیازی رقم تھی۔ اسی بے نیاز انداز میں سموسہ کھاتے ہوئے اس کی نظر یکدم ہی ایمان پر پڑی تھی، جو اپنا سینڈ وچ ختم کرنے کے بعد اب ٹکٹکی باندھے اسے ہی دیکھ رہی تھی۔ اور پھر ایمان کو اس کے چہرے پر ناگواری ابھرتی نظر آئی تھی۔

یکدم ہی وہ اپنی سموسے کی پلیٹ اور باقی سامان ہاتھوں میں سنبھالتی اٹھ کھڑی ہوئی تھی اور ایمان کی جانب بڑھی تھی۔ اس کو اپنی جانب آتا دیکھ ایمان یکدم ہی سیدھی ہوئی تھی۔ پھر نجانے کیوں اپنے بال کان کے پیچھے اڑسے تھے۔ اس لڑکی سے ڈر سا لگا تھا۔۔۔یا شاید اس کے ایسے دیکھنے سے ڈر لگا تھا۔

"مسلسل میرے سموسوں پر نظریں گاڑھ کر میرے پیٹ میں درد کروانے کا ارادہ کیسے آئی ہو؟"،وہ اس کے سر پر پہنچی میٹھے سے طنزیہ انداز میں بولی تو ایمان کو نجانے کیوں شرمندگی سی ہوئی۔حالانکہ وہ تو اس کے سموسوں کو دیکھ بھی نہیں رہی تھی۔وہ تو اسے دیکھ رہی تھی۔

"آ۔۔۔نہیں۔۔۔میں آپ کے سموسوں کو نہیں دیکھ رہی تھی۔۔۔میں تو آپ کو۔۔۔"،ابھی اس کی بات ختم بھی نہیں ہو پائی تھی کہ اس لڑکی کی آنکھیں واضح طور پر پھیلی تھیں۔پھر ان میں ایک انجانی سی چبھن ابھر کر معدوم ہوئی تھی۔وہ اس کے سامنے رکھی کرسی گھسیٹ کر میز پر سامان پھینکنے کے سے انداز میں رکھتی،بیٹھ گئی تھی۔

"مجھے کیوں؟ہاں؟مجھے کیوں دیکھ رہی تھی؟کوئی لطیفہ لکھا ہے میرے چہرے پر؟"،وہ ایک بار پھر اسی میٹھی چھری والے انداز میں بھنویں اٹھائے پوچھنے لگی تو ایمان خجل سی ہوئی،اب کھنکار کر سیدھی ہو بیٹھی۔پھر ادھر ادھر نگاہیں پھیرتے ہوئے اس نے اپنے سامنے پڑا بیگ اٹھایا تھا۔اور ابھی وہ اٹھنے ہی لگی تھی کہ اسے ٹھہرنا پڑا۔

"واپس تشریف رکھو۔"،وہ لڑکی اب پھر سے نگاہوں سے تحکمانہ انداز میں اسے بیٹھنے کو کہہ رہی تھی۔ ایمان کو چار و ناچار واپس بیٹھنا ہی پڑا۔

"چالیس روپے کا سموسہ ہے اور پچاس روپے کا جوس۔ ٹوٹل نوے روپے۔۔۔ ہیں تمہارے پاس تو جاؤ لے آؤ جا کر اپنے لیے۔"،اس نے سموسہ کھاتے ہوئے کہا تو ایمان نے شرمندگی سے سر نفی میں ہلایا۔

"آپ غلط سمجھ رہی ہیں۔ مجھے سموسہ نہیں کھانا۔"، عجیب شرمندگی نے آن گھیرا تھا۔ وہ بس اسی وقت اٹھ کر یہاں سے بھاگ جانا چاہتی تھی۔

"تو پھر کیا جوس پینا ہے؟"،اس نے بولتے ہوئے جوس کی اسٹرا منہ سے لگائی تھی۔

"نہیں۔ جوس بھی نہیں پینا۔"،پہلو بدلتے ہوئے ایمان نے ایک گہرا سانس لیا تھا۔

"تو کیا مجھے کھانا ہے؟ گھور تو ایسے ہی رہی تھی۔۔۔"اس کے کہنے پر ایمان کا جی چاہا تھا کہ زمین پھٹے اور وہ اس میں سما جائے۔

www.novelsclubb.com

"میں بس یونہی آپ کی ہمت دیکھ کر امپریس ہو رہی تھی۔ مگر اب سوچ رہی ہوں کہ نہیں ہونا چاہیے تھا۔"، وہ اب کے منہ بنا کر بولی تو سامنے بیٹھی لڑکی کا حیرت کے مارے منہ کھل گیا۔ اس نے بے حد حیرانی کے عالم میں ایمان کو دیکھا تھا۔

"میں نے کون سی ہمت کے مظاہرے کر دیئے، بہن؟"، وہ جیسے بہت ہی زیادہ حیران ہوئی تھی۔

"آپ جیسے ان لڑکوں سے نمٹیں، میں بہت متاثر ہوئی ہوں۔ بہت ہمت ہے آپ میں۔"، ایمان بول کر آخر میں دھیرے سے مسکرائی تو وہ ہنس پڑی۔

"ارے اسے نمٹنا تھوڑی کہتے ہیں۔ اسے تو بس لوگوں کو سیدھا کرنا بولتے ہیں۔ خیر، تم بتاؤ۔ اپنی تعریف۔"، اس نے اب کے ٹھوڑی تلے ہتھیلی ٹکا کر استفسار کیا تو ایمان ہلکا سا مسکرائی۔

"ایمان۔۔۔ ایمان نام ہے میرا۔ آپ کا؟"

www.novelsclubb.com

"میرا نام ہانا ظفر ہے۔ سائیکالوجی کے ڈیپارٹمنٹ کی ہوں۔ آج پہلا دن ہی ہے میرا۔ ابھی جو دو نکھٹو گئے ہیں یہاں سے، وہ میرے ساتھ اسکول میں بھی پڑھ چکے ہیں۔ اسی لیے کچھ زیادہ فری ہونے کی کوشش کر رہے ہیں۔۔۔ مگر ڈونٹ وری۔ مجھے بھی ایسے نالائقوں کا علاج بہت اچھے سے کرنا آتا ہے۔"، بول کر اس نے شانے جھٹکے تھے۔ ایمان مسکرائی تھی۔ اسے اس کا یہ اسٹائل بہت بھایا تھا۔

"میں انگلش لٹریچر کے ڈیپارٹمنٹ کی ہوں۔ میرا بھی آج پہلا ہی دن ہے۔"، وہ مسکرا کر بولی تو اس سارے وقت میں ہانا بھی پہلی بار مسکرائی۔

"تم اتنی چوئی موئی سی کیوں ہو؟"، اس نے کچھ حیرت لہجے میں سموئے کہا تو ایمان کا قہقہہ بے ساختہ تھا۔ اسے حیدرآباد چھوڑے تقریباً چھ ماہ ہونے کو آئے تھے۔ اس سارے عرصے میں اس کی غزل اور ثمرین سے بہت بننے لگی تھی۔ اوپر سے میرال سے بھی رابطہ اور ملنا جلنا

تھا۔ مگر ان میں سے کسی کے بھی ساتھ وہ یوں کھل کر نہیں ہنسی تھی۔ اس لڑکی میں کچھ تھا جو اسے منفرد بناتا تھا۔

کچھ اچھا! کچھ الگ! کچھ کمفرٹنگ سا!

***

رات کا اندھیرا کافی حد تک حیدرآباد پر چھا چکا تھا۔ گزشتہ کچھ روز مسلسل وقفے وقفے سے بارش ہوتی رہی تھی۔ مگر آج بارش مکمل طور پر رک گئی تھی۔ بارش کے بعد جو نہی آسمان پر سے دھول کی دھند چھٹی، اجلا اجلا سا سیاہ آسمان نگاہوں کو خیرہ کر دینے کی حد تک حسین لگنے لگا۔ ستاروں کے جھرمٹ کے درمیان چاند کسی گول ٹکیاں کی مانند چمک رہا تھا۔

ایسے میں ایک گھر کی چھت پر دو نفوس ایک تخت پر بیٹھے تھے۔ ایک نے چہرہ آسمان کی جانب اٹھا رکھا تھا تو دوسرے نے ایک کہنی کے بل لیٹے، چہرے اس کی جانب موڑ رکھا تھا۔ وہ ان کے چہرے پر کچھ تلاش کر رہی تھی، مگر ان کے چہرے پر صرف ایک ہی تاثر رقم

تھا۔۔۔افسوس کا تاثر۔انہیں گھر چھوڑے تیسرا روز ہونے کو آیا تھا مگر اب تک زاویار صاحب کی جانب سے خاموشی چھائی تھی۔

اسے لگ رہا تھا کہ اور کچھ نہیں تو وہ رضیہ کو منانے ضرور آئیں گے، مگر اس کا یہ خیال غلط ثابت ہوا تھا۔ رضیہ کے گھر چھوڑنے پر ان کی انا پر جو مختصر سی دراڑ پڑی تھی،شاید اب وہ بھی بھر گئی تھی۔وہ پھر وہی انا پرست زاویار بن گئے تھے۔ مگر ایک خیال اسے آتا رہا تھا۔ کیا وہ اسے بھی بھول گئے تھے؟اپنی سب سے لاڈلی بیٹی کو؟

ہاں، مگر اس نے بھی تو کوئی گنجائش نہیں چھوڑی تھی ناں!وہ ماں کے ساتھ کھڑی تھی، بہن کے حق کے لیے بول رہی تھی،باپ سے لڑ پڑی تھی،مگر پھر بھی،اندر کہیں دل میں یہ خلش سی موجود تھی۔۔۔یہی کہ اب وہ ان کی پسندیدہ نہیں رہی۔ لاڈلی نہیں رہی۔۔۔اور یہ خلش دیمک کی طرح اس کی ہمت کو کھا رہی تھی۔

novelsclubb@gmail
www.novelsclubb.com
IG: @novelsclubb

"جانتی ہو، فاطمہ ؟"، جبھی رضیہ کی آواز ابھری تو اس کا سکتہ ٹوٹا۔ وہ ہوں کہتی ان کی جانب متوجہ ہوئی تھی۔ وہ اب سیدھی ہو بیٹھی تھیں اور سیدھ میں اس کی آنکھوں میں ہی جھانک رہی تھیں۔

"جب آدم پیدا ہوا تھا۔۔۔ تو زاویار صاحب کی خوشی دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ ان کے پیر زمین پر نہیں ٹک رہے تھے۔"، وہ ٹھہر ٹھہر کر، دھیرے دھیرے بول رہی تھیں۔ "پہلوٹی کی اولاد، وہ بھی لڑکا۔۔۔ خاندان بھر میں مٹھائیاں بانٹی گئیں، عقیقہ کیا گیا، غریبوں میں کھانا تقسیم کیا گیا۔۔۔ پھر آیا زرار۔۔۔ اس کی پیدائش پر بھی کوئی مختلف اہتمام نہ ہوا تھا۔ خوشیاں محسوس بھی کی جارہی تھیں اور تقسیم بھی کی جارہی تھیں۔۔۔"، اب کے انہوں نے ایک گہرا سانس لے کر آنکھوں میں ابھر آئی نمی کو پونچا تھا۔

"پھر، ایمان کی پیدائش ہوئی۔ وہ بھی تم لوگوں کی ہی طرح بہت پیاری پیدا ہوئی تھی۔ اس کو جو دیکھتا، اس کے منہ سے بے ساختہ ماشاءاللہ نکلتا۔ سب خوش تھے، سوائے زاویار صاحب

کے۔ ایمان کو پہلی بار گود میں لیتے ہی انہیں ایک چپ سی لگ گئی تھی۔ ان کے چہرے پر رقم خاموشی کسی اور نے نوٹ کی ہو یا نہ کی ہو، میں نے ضرور کی تھی۔۔۔ ان کے چہرے پر ایک الجھن سی بھی نظر آنے لگی تھی۔۔۔ میں پہلے پہل تو اس بات کی وجہ نہ سمجھ پائی تھی۔ مگر پھر ایک دن۔۔۔

)رات کے پہر کمرے میں نومولود بچی کے رونے کی آوازیں گونج رہی تھیں۔ بستر پر ایک جانب زاویار کروٹ لیے لیٹے تھے۔ کانوں پر تکیہ رکھے، چہرے کے زاویے بگاڑے، وہ لب بھینچے ہوئے تھے۔ آنکھیں بھی بھینچنے کے سے انداز میں موندر کھی تھیں۔ ان کی پشت پر رضیہ دو ماہ کی ایمان کو گود میں لٹائے، مسلسل چپ کروانے کی کوششوں میں ہلکان ہوئے جا رہی تھیں۔ آنکھیں آنسوؤں سے لبریز تھیں۔ دو دن ہونے کو آئے تھے۔ ایمان کا بخار کنٹرول میں آنے کے بجائے بڑھتا چلا جا رہا تھا۔ وہ گھر میں ہر ممکن علاج کر کے دیکھ چکی تھیں۔

"کیا ہو گیا ہے، رضیہ؟ کیوں دو دن سے مسلسل روئے جا رہی ہے؟ ایک پل سکون کا سانس نہ خود لے رہی ہے نہ تمہیں لینے دے رہی ہے۔"، ایک دم ہی زاویار جھٹکے سے پلنگ پر اٹھ بیٹھے تھے۔ ان کا سپید چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا تھا۔ او پر سے، قدرے بلند آواز کے باعث ایمان کے رونے میں تیزی آ گئی تھی۔

"اسے اب تک بخار ہے، زاویار۔ ڈاکٹر کے پاس لے چلیں اسے۔"، رضیہ نے پریشانی کے عالم میں کہا تو زاویار ٹھٹھکے۔ پھر یکدم جھک کر ایمان کے ماتھے پر ہاتھ رکھا۔۔۔ پھر چہرے پر پریشانی کے کچھ آثار لیے پیچھے ہوئے۔

"اس کو بخار ہے۔۔۔ تم نے مجھے بتایا کیوں نہیں؟"، انہوں نے پوچھا تو رضیہ نے انہیں بے بسی کے عالم میں دیکھا۔

www.novelsclubb.com

"بتایا تو تھا، زاویار۔ آپ نے کہا کہ پٹیاں کرو۔ کر لیں پٹیاں بھی۔ سب کر کے دیکھ لیا۔"،وہ رو دینے کو تھیں۔ زاویار صاحب نے "اوہ اچھا" کہہ کر سائیڈ ٹیبل سے اپنی گاڑی کی چابی اٹھائی تھی۔ پھر اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔

"چادر اوڑھ کر لے آؤ اسے باہر۔ میں گاڑی میں انتظار کر رہا ہوں۔"،وہ تو کہہ کر باہر چلے گئے مگر رضیہ کی آنکھوں سے ایک کے بعد ایک آنسو ٹپکنے لگے تھے۔ آج وہ جان گئی تھیں کہ زاویار کا ایمان سے تعلق صرف فرائض کا تھا، محبت کا نہیں۔ اولاد سے فطری انسیت تو انہیں تھی، مگر اس انسیت میں محبت کا عنصر بہت تھوڑا شامل تھا۔)

اس کے بعد انہوں نے مجھ سے کئی بار کہا کہ ایمان کی رنگت پر محنت کروں۔ میں ان کے کہنے پر ایمان کے ہاتھوں پیروں اور چہرے پر نجانے کیا کیا لگاتی رہتی۔۔۔وہ جو کہتے، میں وہ لگاتی۔۔۔میں بس یہ چاہتی تھی کہ کسی طرح وہ ایمان کو بالکل ویسے ہی خوش دلی سے قبول کریں جیسے انہوں نے آدم اور زرار کو کیا تھا۔۔۔میں بس ان کے دل میں موجود انسیت کو

www.novelsclubb.com

محبت میں تبدیل کرنا چاہتی تھی۔۔۔بے لوث محبت میں۔۔۔مگر۔۔۔"، آنسو ٹپکنے لگے تھے۔ دل جلنے لگا تھا۔ "مگر میں ناکام ٹھہری، فاطمہ۔۔۔میں ناکام ٹھہری۔ میں اچھی بیوی تو بن گئی، مگر ایک اچھی ماں نہ بن سکی۔"، وہ بولتے ہوئے روتی جا رہی تھیں۔ فاطمہ یکدم ہی آگے بڑھ ان کو خود سے لگا گئی تھی۔

"ابا کی غلطی کا قصوروار خود کو کیوں ٹھہرا رہی ہیں؟ یہ نا انصافی ہے۔۔۔اور اب بس، میں مزید نا انصافی نہیں ہونے دوں گی ہمارے ساتھ۔"، اس نے ان کو خود سے دور کرتے ہوئے محبت سے ان کا چہرہ پونچا تھا۔ پھر آگے بڑھ کر ان کی گود میں سر رکھ کر لیٹ گئی تھی۔

"آپ نہ روئیں، امی۔ آپ بالکل نہ روئیں۔"، کہتے ہوئے ہنوز لیٹے ہوئے اس نے ان کے دونوں ہاتھ تھام کر باری باری چومے تھے۔

آسمان پر جھلملاتے ستاروں اور ان کے بیچ چمکتے ماہتاب نے اداس سی مسکراہٹ سے ان دونوں کو دیکھا تھا۔

www.novelsclubb.com

***

یونیورسٹی کے وسیع و عریض کاریڈور سے وہ اس سمے تقریباً دوڑتی ہوئی کمرہ جماعت تک جا رہی تھی۔ آج وہ ویسے ہی بہت لیٹ ہو گئی تھی۔ دوسرا ہی دن، اور دوسرے ہی دن لیٹ ہو جانا۔۔۔یہ کچھ خاص اچھا نہیں لگتا تھا۔ پھولے سانسوں کے درمیان ابھی وہ ایک دیوار کے موڑ سے مڑی ہی تھی کہ کسی سے زوردار تصادم نے اس کے چودہ طبق روشن کر دیئے تھے۔ اس کے ہاتھ میں تھاما ایک رجسٹر بھی تھپاک سے زمین بوس ہوا تھا۔ مقابل کے ہاتھ سے بھی چند ایک کتابیں ان دونوں کے ساتھ ہی زمین پر گری تھیں۔

www.novelsclubb.com

گرتے ہی اس کا سر پاس کی دیوار سے ٹکرایا تو چند پلوں کے لیے یونیورسٹی جیسے اس کے سر پر گھوم کر رہ گئی۔ گھٹنا بھی دھپ سے کسی چیز سے ٹکرایا تھا۔ پھر بمشکل سر کو سنبھالے اس نے سامنے دیکھا تو سامنے ہی ہانا نظر آئی۔ وہ بھی اس ہی کی طرح زمین پر گری اپنا ماتھا سہلا رہی تھی۔ چشمہ ناک پہ ٹیڑھا ہوا پڑا تھا۔ بستہ ایک کاندھے سے بازو تک آ کر جھولنے لگا تھا۔ خود کو

سنبھالتے اس نے جس پل اس کو دیکھا، ایمان نے آنکھیں میچی تھیں۔ کل کی کلاس کے بعد لگتا ہے آج دوبارہ اس کی کلاس کی باری آ گئی تھی۔

آس پاس کھڑے طلباء ایک نظر ان کو دیکھ کر، اگنور کیے آگے بڑھ گئے تھے۔

ہانا نے سر دو تین بار جھٹک کر اپنی عینک صحیح کی اور پھر اسے دیکھ کر ہلکا سا مسکرائی۔

"سوری۔"، اس کی دھیمی سی آواز میں کہے جانے والے اس لفظ نے ایمان کو ایک زوردار جھٹکا دیا تھا۔ کیا وہ اسے سوری کر رہی تھی؟ کہیں اس کا سر بھی تو دیوار میں زور سے نہیں لگ گیا تھا؟

"آپ کے سر پر لگا ہے کیا؟"، شدید حیرت میں مبتلا ایمان نے اس سے پوچھا تو ہانا نے بے اختیار اپنا ماتھا ایک بار پھر سہلایا۔

"ہاں لگا تو ہے۔"، اس نے اپنی آنکھیں میچ کر کھولی تھیں۔ وہ سوری تو اس لیے کر رہی تھی کہ وہ دوڑتی ہوئی آ رہی تھی۔ مگر یہ ایمان کیا سوچ رہی تھی؟

"کیا؟ دیوار؟"۔ ایمان نے ہمدردی سے پوچھا تو ہانا نے بے اختیار سر نفی میں ہلایا۔

"نہیں! تمہارا اتنا بڑا پتھر جیسا گھٹنا۔۔۔ہائے، مجھے تو لگ رہا ہے کہ کھوپڑی میں کریک پڑ گیا ہے۔"، کہتے ہوئے اس نے اپنا سر دونوں ہاتھوں سے پکڑا تھا۔ ایمان نے ناسمجھی سے اسے دیکھا تھا۔

"میرا گھٹنا آپ کے سر تک کیسے پہنچا؟"۔ لہجے میں دنیا جہاں کی معصومیت اور لاعلمی سموئے اس نے آنکھیں پٹپٹا کر پوچھا تو ہانا نے سر ہنوز تھامے ہی وہی میٹھی طنزیہ مسکراہٹ اس کی جانب اچھالی تھی۔

"تمہارا گھٹنا میرے سر تک نہیں پہنچا۔ میرا سر تمہارے گھٹنے تک پہنچا ہے، ایمان۔"، اس نے بہت ہی ضبط کر کے کہا تھا۔ ایمان کے چہرے پر پھیلی ناسمجھی مزید گہری ہوئی تھی۔

اس نے بے اختیار اپنے سر پہ دکھتی جگہ کو تھاما تھا۔ اس کا سر دیوار میں لگا تھا۔ شاید زور سے ہی لگا تھا، جبھی اچھا خاصا درد ہو رہا تھا۔ اوپر سے ہانا کی یہ مشکل باتیں! اف!

novelsclubb@gmail
www.novelsclubb.com
IG: @novelsclubb

"مگر وہ کیسے؟"، اس نے پوچھا تو ہانا نے بے ساختہ ہی ساتھ کھڑی دیوار کو پکڑا تھا، پھر اپنا سر اس دیوار کی جانب پھینکنے لگی تو ایمان نے یکدم ہی آگے بڑھ کر اس کو پیچھے کیا تھا۔

"کیا کر رہی ہیں آپ یہ؟"، وہ پریشانی سے بولی تھی۔

"اپنا سر دیوار میں مار رہی ہوں۔"، ہانا نے آگے بڑھ کر اپنی کتاب جھپٹنے کے سے انداز میں اٹھائی تھی۔۔۔ کتاب کے برابر ہی ایمان کا رجسٹر بھی گرا پڑا تھا۔ اس نے ہاتھ ذرا سا بڑھا کر وہ بھی اٹھا لیا تھا۔ ایمان کا دھیان اب بھی اسی کھچڑی پر تھا جس میں اس کا ننھا سا دماغ الجھا ہوا تھا۔

www.novelsclubb.com

"کیوں مار رہی ہیں دیوار میں؟ ویسے ہی چوٹ لگی ہوئی ہے آپ کو۔"، اس نے فکرمندی سے کہا تو اب کے بے ساختہ ہی ایک مسکراہٹ ہانا کے لبوں پر ابھری تھی۔

"ارے میری ماں۔۔۔ میں سمجھ گئی۔ تمہیں میری بات نہیں سمجھ آنی۔ آخر کو ظاہر ہے، تمہارے گھٹنے پر چوٹ جو لگی ہے۔۔۔ اور دماغ تمہارا گھٹنے میں ہی تھا۔۔۔ تو سمجھ سکتی ہوں

میں کہ ابھی تھوڑی دقت ہو رہی ہو گی سمجھنے میں۔"، کہتے ہوئے اس نے ایمان کا رجسڑ اس کی جانب بڑھایا جسے ایمان نے سرعت سے تھام لیا۔

"چلو اٹھو اب۔"،اس نے کھڑے ہوتے ہوئے ہاتھ ایمان کی جانب بڑھایا تھا جسے تھام کر ایمان اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

"توبہ ہے ویسے۔۔۔ ہمیشہ سوچا تھا کہ یوں کسی ہینڈسم سے لڑکے سے ٹکر ہو گی۔ میں زمین پر گروں گی تو وہ میری کتابیں اٹھا کر مجھے تھمائے گا۔۔۔ پھر یونہی ہاتھ دے کر مجھے اٹھائے گا۔۔۔اف کورین ڈرامے کی پہلی قسط شوٹ ہو گی۔۔۔اور یہاں۔۔۔ میں ہی ان محترمہ کی ہیرو بنی ہوئی ہوں۔۔۔ چچ چچ چچ!"،وہ دونوں چلتی ہوئی اب گراؤنڈ کی جانب بڑھ رہی تھیں۔ وہ دونوں ہی جلدی جلدی میں دوڑتی ہوئی اپنے کمرہ جماعت کی جانب بھاگ رہی تھیں۔۔۔ مگر اب لگ رہا تھا کہ چوٹوں کا واقعی دماغ پر اثر ہوا تھا کہ وہ سب بھولے اب گراؤنڈ کی جانب جا رہی تھیں۔

ایمان اسی منمناتے انداز میں کچھ کہہ رہی تھی جس پر ہانا نے اس کے سر پر ہلکی سی چپت لگائی تھی۔

پیچھے دونوں کی کلاس میں پروفیسر زان کے نام پکار رہے تھے مگر وہ کلاس میں ہوتیں تو جواب دیتیں ناں۔ وہ تو آرام سے درخت کے نیچے لگی بینچ پر بیٹھی اب ہلکی پھلکی گفتگو کر رہی تھیں۔

اور کچھ لوگ واقعی زندگی میں فضا کے کسی تازگی بخش جھونکے کی مانند داخل ہوتے ہیں۔ جو آتے ہی آنسو سو کھانے لگتے ہیں۔ زندگی کی تپتی دھوپ میں کسی نرم چھاؤں کی مانند لگنے لگتے ہیں۔

www.novelsclubb.com

***

وقت کی دھار پہ نقش واقعات میں کچھ پیچھے جایا جائے تو رمیص جہانزیب کی زندگی کے ابتدائی ابواب نگاہوں کے سامنے آئیں۔ رمیص اور اس کا خاندان اسلام آباد میں مقیم تھے۔ وہ اور اس

کا چھوٹا بھائی، زید، ابھی چند ہی برس کے تھے جب ایک کار ایکسیڈنٹ میں ان دونوں کے والدین چل بسے تھے۔ رمیص اس وقت صرف سات سال کا تھا۔ زید پانچ سال کا تھا۔ کسی ہنستی بستی زندگی کا اجڑنا کیا ہوتا ہے، وہ اس سمے سب نے ہی دیکھا تھا۔

رمیص کے والد اکلوتی اولاد تھے۔ نہ ان کے کوئی بہن بھائی تھے نہ والدین۔ سو رمیص کی نانی ان دونوں کو اپنے پاس لے آئیں۔ وہ ان دونوں کا بہت خیال رکھتی تھیں مگر بات کچھ یوں تھی کہ ان کے حالات بھی کچھ ٹھیک نہ تھے۔ مجبوراً سات اور پانچ سال کی عمر میں رمیص اور زید کو اسکول کو وداع کرنا پڑا۔ زید کو تو شاید اتنا محسوس نہ ہوتا تھا، مگر رمیص کا دل سب سوچ سوچ کر پیسجتا رہتا تھا۔ یوں تو وہ ویسے بھی بڑا سمجھدار ہی تھا، اوپر سے باریک بین اور حساس بھی بہت تھا۔ وہ کسی سے کچھ کہتا نہیں تھا۔۔۔ درحقیقت اس کے پاس کوئی تھا ہی نہیں جس سے وہ کچھ کہہ پاتا۔

وہ محض دس سال کا تھا جب ایک روز اس نے نانی کو اپنے کمرے میں بستر پر بے سدھ پایا تھا۔ ان کے جسم میں کوئی حرارت و حرکت نہیں بچی تھی۔ آنکھیں ایک نقطے پر ساکت تھیں اور گردن ایک جانب کو ڈھلکی ہوئی تھی۔ انہیں نانی کے ساتھ رہتے یہ تیسرا سال تھا اور اب جیسے وہ واحد چھت جو ان کے سر پر برقرار تھی، وہ بھی چھن گئی تھی۔ جس گھر میں نانی رہتی تھیں، وہ ان کے نانا کی جائیداد کا وہ حصّہ تھا جو اس کی والدہ اور نانی کے حصّے میں آیا تھا۔۔۔ مگر اس کے ماموؤں نے بٹوارا شروع کر دیا تھا۔

اس کے دو ماموں تھے۔ گھر کے بٹوارے کے بعد جب باری ان دونوں کی آئی تو انہیں بھی بانٹ دیا گیا۔ زید کو اس کے بڑے ماموں اپنے ساتھ لاہور لے گئے تھے جبکہ وہ چھوٹے ماموں، قربان صاحب اور ممانی، سگرہ کے ہمراہ اسلام آباد میں ہی ٹھہرا رہ گیا تھا۔ اور زندگی میں پہلی بار اسے حقیقتاً علم ہوا تھا کہ تنہائی کسے کہتے ہیں۔ ماموں سارا دن کام پر ہوتے تھے۔ وہ محنت کش طبقے سے تعلق رکھنے والے نفیس سے انسان تھے۔ سادہ سے۔ مگر مامی کافی تیز واقع

ہوئی تھیں۔ ماموں کی غیر موجودگی میں وہ سارا دن اسے کوستی رہتیں۔ طعنوں سے اس کا جینا دوبھر کیے رکھتیں۔ کبھی اسے گھنٹوں اسٹور روم میں لاک کر دیتیں تو کبھی چھت پر بند کر دیتیں۔ رمیص کی ایک عادت تھی کہ وہ بہت خاموش رہا کرتا تھا۔ کوئی ڈانٹتا، کوئی ذلیل کرتا، کوئی پیار کرتا یا کوئی مذاق کرتا، وہ خاموش ہی رہا کرتا تھا۔ صرف زبان پہ نہیں، چہرے پر بھی ایسی ہی خاموشی کا راج رہا کرتا۔

انہی دنوں خاندان کی ایک شادی کے موقع پر اسے زید ملا تھا۔ وہ دونوں تقریباً آٹھ ماہ بعد ایک دوسرے سے مل رہے تھے۔ مگر جس شے نے رمیص کو ورطہ حیرت میں مبتلا کیا تھا، وہ زید کے جسم کے مختلف حصوں پر ثبت نشانات تھے۔ وہ مار پیٹ کے نشانات تھے۔۔۔ اور اس لمحے بس بہت ہو گیا تھا۔۔۔ سب اس کی برداشت سے باہر ہو گیا تھا۔ اس رات واپسی پر اس نے قربان صاحب سے اس متعلق بات کی تو وہ بھی شدید حیرت میں مبتلا ہو گئے۔ انہوں نے اس سے وعدہ کیا کہ وہ زید کو بھی اپنے پاس لے آئیں گے۔۔۔ مگر۔۔۔

مگر وہ تو یہ بھی نہیں چاہتا تھا۔ سگرہ کا رویہ جیسا بھی تھا،اس کے ساتھ تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ زید بھی اسی ذہنی اذیت سے گزرے جس سے وہ روز گزرتا تھا۔۔۔ سو اس رات اس نے ماموں کو سب بتا دیا۔۔۔ سگرہ کا اس کے ساتھ کیسا رویہ تھا،سب کچھ!

اور اس پورے عرصے میں اس نے پہلی بار ماموں کو غصے سے سرخ ہوتے دیکھا تھا۔ دیر رات تک اسے ماموں اور ممانی کے جھگڑنے کی آوازیں آتی رہی تھیں۔ وہ کیا کہہ رہے تھے،اسے کچھ سمجھ تو نہیں آرہا تھا،مگر اتنا ضرور سمجھ آرہا تھا کہ ماموں اس کے لیے لڑ رہے تھے۔ اپنی بیوی سے اس کے لیے جھگڑ رہے تھے۔ اس روز اس کے دل میں ماموں کا مقام بہت بڑھ گیا تھا۔

اگلے روز سگرہ کے تیور ہی الگ تھے۔ وہ اتنی میٹھی تھیں کہ جس کی کوئی حد نہیں۔ اتنے عرصے میں پہلی بار اسے اپنے پاس بٹھا کر کھانا کھلایا۔ اسے پیار سے پکارا۔ اس کی سمجھ سے سب باہر تھا۔ بس دل میں ایک اطمینان تھا کہ اللہ تعالیٰ نے اس کے لیے ایک محافظ بھیج دیا ہے۔ چند

ہفتوں میں ہی زید بھی وہاں اس کے ساتھ تھا۔ ماموں نے پاس کے ہی ایک اسکول میں ان کا داخلہ کروادیا تھا۔ وہ اسکول چھوٹا سہی، مگر اچھا تھا۔

وقت یوں ہی گزرتا گیا۔ برس یوں ہی پر لگا کر اڑ گئے۔ وہ اٹھارہ سال کا ہو گیا تھا۔ ابھی چند ہی روز پہلے وہ ماموں کے ساتھ جا کر اپنا شناختی کارڈ بنوا کر آیا تھا۔ کہ ایک روز وہ رات کو پانی پینے کے لئے اٹھا تھا۔۔۔ اور کتنے ہی روز وہ یہ سوچ کر کانپتا رہا تھا کہ اگر جو وہ اس رات نہ جاگتا تو؟

ماموں اور ممانی کمرے میں اونچی آواز میں لڑ رہے تھے۔ ان کی آوازیں باہر تک بالکل صاف آ رہی تھیں۔ مامی نے جو کہا، اس نے اس کے قدم روکے تھے۔

www.novelsclubb.com

"جلدی نام کریں گھر اپنے اور فارغ کریں انہیں یہاں سے۔۔۔ برداشت نہیں ہوتے مجھے اب یہ یہاں مزید۔"

وہ ساکت سا ماموں کے اپنے حق میں بولنے کا منتظر تھا۔

"ہاں ناں۔۔۔ کرلیا ہے انتظام۔ ہزار بار کہہ چکا ہوں کہ آہستہ بولو۔ کہیں سن لیا ناں دونوں نے تو سالوں کے منصوبے پر پانی پھر جائے گا۔ کاغذات اسی کے کمرے میں رکھے ہیں۔ لے کر بھاگ گیا تو؟؟؟ مگر پاگل عورت ہو۔ جب بھی بات کروگی، منہ پھاڑ کر کروگی۔"ماموں کی آواز قدرے دھیمی مگر سخت و سرد تھی۔ اور اس روز اسے محسوس ہوا تھا جیسے ایک بار پھر اس کے سر سے چھت چھین لی گئی ہو۔

"اتنا آسان نہیں ہوگا، قربان۔ وہ اب بچہ نہیں رہا۔ اٹھارہ سال کا جوان لڑکا بن چکا ہے۔ اگر اس نے دستخط کرنے سے انکار کر دیا تو؟"، سگرہ فکر مندی سے بولی تھیں۔۔۔

"تو میری بندوق نکال کر رکھو۔ زید کے سر پر بندوق رکھ کر دستخط کرواؤں گا۔ وہ اپنی پرواہ تو نہیں کرتا مگر زید کے لیے وہ جان کی بازی لگانے کو بھی تیار رہتا ہے۔"، اور ماموں کے سرد انداز میں کہے جانے والے اس جملے نے حقیقی طور پر اس کے پیروں تلے سے زمین سرکا دی تھی۔

اس رات وہ ماموں ممانی کے سوتے ہی زید کو اپنے ہمراہ لیے، کاغذات اور ضروری چیزیں سمیٹے وہاں سے دبے پاؤں نکل آیا تھا۔ وہ اپنے بابا کے گھر چلا آیا تھا۔۔۔ گزرے سالوں میں اسے بہت بار یہی بتایا گیا تھا کہ اس کے بابا کا گھر اس کا اپنا نہیں تھا۔ وہ محض کرائے کا گھر تھا۔

اگلی صبح ایک کہرام مچا تھا۔ اس کے دونوں ماموں ان کے گھر کے باہر پہنچے ہوئے تھے۔ ان کے ہاتھوں میں بندوقیں تھیں اور آنکھوں میں خون اترا ہوا تھا۔ وہ کافی دیر تک گھر میں گھسنے کی ہر ممکن کوشش کرتے رہے تھے مگر ان کے گھر کا سیکیورٹی سسٹم کافی جدید تھا۔ ان کا گھسنا ناممکن ہو گیا تو وہ آخر کار بیزار ہو کر واپس چلے گئے۔ اس پورے وقت وہ دونوں نہایت خاموشی سے ایک کمرے میں بند ہوئے بیٹھے رہے تھے۔ ان کی دھڑکنیں تیز تھیں اور چہرے برف کی مانند سفید تھے۔ خوف، دکھ، اذیت، بے بسی۔۔۔ کیا کیا تھا جو وہ محسوس نہیں

کر رہے تھے۔۔۔انہیں زندگی میں ان کے اپنوں نے ہی سب سے بڑے دھوکے دیے تھے۔۔۔ایسے اپنے جنہیں خون کے رشتے بھی کہا جاتا ہے۔۔۔

وہ دنیا میں تنہا رہ گئے تھے۔۔۔ان کے پاس کوئی بھی نہیں بچا تھا۔۔۔اور پھر زندگی نے ان کے سامنے ایک اور فیز پیش کیا تھا۔۔۔محنت کا فیز! مشقت کا فیز! اپنے دم پر کچھ کرنے کا، کچھ بننے کا فیز!

ان دنوں رمیص کا کالج حال ہی میں ختم ہوا تھا۔اس کے پاس یونیورسٹی کے داخلے کے لیے رقم نہیں تھی۔۔۔کالج کے ایک دوست کے توسط سے اس نے ایک جگہ انٹرن شپ شروع کر دی تھی۔چونکہ نہ اس کی اتنی پڑھائی تھی نہ کوئی تجربہ، تو اسے بہت مشکل کا سامنا کرنا پڑا۔ زید کا میٹرک ہو چکا تو اس کا میرٹ پر ایک کالج میں داخلہ ہو گیا۔کچھ پس و پیش کے بعد جو تھوڑی بہت فیس رہ گئی تھی، وہ بھی کالج والوں نے معاف کر دی تھی۔اس کے سر سے ایک بہت بڑی ٹینشن اتری تھی۔البتہ خود اب وہ پڑھائی چھوڑے بیٹھا تھا۔

چھ مہینے انٹرن شپ کو ہونے کو آئے تھے کہ ایک روز اس کے اسی دوست نے ان کے ہاں چکر لگایا تھا۔ زید کالج گیا ہوا تھا کہ اس کے امتحانات شروع ہونے والے تھے۔ البتہ ہفتہ ہونے کے باعث اس کی آفس سے چھٹی تھی۔ وہ دونوں لاؤنج کے صوفے پر ایک دوسرے کے برابر بیٹھے ہوئے تھے کہ رمیص نے چہرہ موڑ کر اسے سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔ وہ ذرا کھنکارا تو رمیص سیدھا ہو بیٹھا۔

"اب بول بھی دو، فیضان۔۔۔ کان ترس گئے سننے کو۔ ایک گھنٹہ ہو گیا ہے تمہیں آئے ہوئے۔"، رمیص کے بولنے پر فیضان اس کی جانب پوری طرح سے گھوما تھا۔

"بابا سے بات ہو رہی تھی میری۔۔۔ تو انہوں نے ایک آئیڈیا دیا مجھے۔۔۔ سننا چاہو گے کہ وہ آئیڈیا کیا تھا؟"، فیضان کے کہنے پر اس نے تجس کے عالم میں سر اثبات میں ہلایا تھا۔ فیضان صوفے پر ایک ہاتھ رکھے اس کے قریب جھکا تھا۔

"بابا کے ایک دوست ہیں۔۔۔ رؤوف انصاری۔۔۔ نام تو سنا ہو گا؟"

"نہیں!"، رمیص نے سر نفی میں ہلایا تو فیضان بد مزہ ہو کر پیچھے ہوا۔ اب کے بغیر کسی لگی لپٹی کے فر فر بولنے لگا۔

"رؤوف انکل ایک بہت بڑے نیوز چینل کے مالک ہیں۔ ابھی کچھ ہی دن پہلے انہوں نے بابا سے کہا کہ بابا مجھے انٹرن شپ کے لیے ان کے چینل بھیج دیں تو بابا نے یونہی ان سے کہہ دیا کہ میرے بیٹے کا ایک دوست بھی آئے گا۔۔۔ اور گیس واٹ؟"، بولتے ہوئے وہ پر جوش سا مزید آگے جھکا تھا۔ رمیص کے دل کی دھڑکنیں تیز ہوئی تھیں۔

"واٹ؟"، دل گویا کانوں میں آ کر دھڑکنے لگا تھا۔ کان کی لوئیں تک سرخ پڑ کر دہکنے لگی تھیں۔

"انہوں نے بلایا ہے ہمیں کل۔۔۔ اب کل چلیں گے دونوں۔۔۔ بابا نے کہا ہے کہ اگر وہاں بات بن گئی تو تم اپنی انٹرن شپ وہیں سے کرنا۔۔۔ اور سب سے بڑی بات!!!"، وہ رک کر بولا تو رمیص نے اسے ایک چپت لگائی۔

"ایک بار میں کیوں نہیں بولتے؟"، ٹینشن دینا اور دل کی دھڑکنیں بڑھانا تو کوئی فیضان سے سیکھے۔

"اگر ہم دونوں سلیکٹ ہو گئے تو رؤوف انکل نے کہا ہے کہ ہماری پڑھائی کا خرچہ مکمل وہ اٹھائیں گے۔ "، اس نے جوش سے بات مکمل کی تو رمیص نے ایک نم سانس خارج کر کے چہرے پہ ہاتھ پھیرے۔ اس کی ساری مشکلات ایک ایک کر کے حل ہوتی جا رہی تھیں۔۔۔ اس کے سارے مسائل سارٹ آؤٹ ہوتے جا رہے تھے۔ اللہ سب سنبھال رہا تھا۔ ہمیشہ سے وہی تو سنبھالتا آیا تھا۔

اگلے روز رؤوف صاحب نے ان کا ایک مختصر سا انٹرویو لیا تھا۔ وہ بہت تیاری کر کے گیا تھا مگر انہوں نے محض چھوٹی موٹی باتیں پوچھنے کے بعد ان دونوں کو ایک ہفتے بعد سے جوائن کرنے کا کہہ دیا تھا۔ وہ اس دن بہت خوش تھا۔ اس کے پیر زمین پر نہیں ٹک رہے تھے۔ زید کو بتایا تو وہ بھی خوشی سے پھولے نہ سما رہا تھا۔

پچھلی انٹرن شپ کی طرح یہ بھی پیڈ تھی مگر اس کی تنخواہ پچھلی والی کے مقابلے بہت اچھی تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ اللہ نے دست رحمت پھیر کر ان کے سارے آنسو پونچھ ڈالے تھے۔

وہ دونوں ہی رؤوف صاحب کی شخصیت اور انداز کے پرستار بن گئے تھے۔ جب رؤوف صاحب انہیں کچھ سمجھا رہے ہوتے تو وہ دونوں انہیں یوں تکتے جیسے وہ آسمان سے اتری کوئی مخلوق ہوں۔ اسی بات پر وہ اکثر رؤوف صاحب سے ڈانٹ بھی سنتے رہتے تھے۔ مگر مجال ہے جو دونوں پر ذرا بھی اثر ہو جائے۔ وہیں کام کرتے ہی ان دونوں نے اپنی ڈگریاں مثالی کارکردگی سے مکمل کی تھیں جس کے بعد فیضان ایک سال کے لیے جرمنی چلا گیا تھا۔ جبکہ رمیص رؤوف صاحب کے انڈر ہی کام کرتا رہا تھا۔ وہ ان کا پسندیدہ بن گیا تھا۔ وہ ہر کام میں اس کی رائے کو اہمیت دینے لگے تھے۔ ہر فیصلے میں اس سے مشورہ لینا ضروری سمجھتے تھے۔

زید نے انٹر کے بعد اسکالرشپ کے لیے اپلائی کیا تھا اور اسکالرشپ ملنے پر وہ چار سال کے لیے ترکی چلا گیا تھا۔۔۔یوں پاکستان میں اب رمیص کے پاس صرف رؤوف صاحب تھے۔ وہ ان کا دوست بن گیا تھا اور وہ اس کے۔

انہی دنوں ایک روز اس کی ملاقات ابراہیم لغاری سے ہوئی تھی۔ ان دنوں وہ وزیر اعظم نہیں بنے تھے۔ مگر رمیص پہلی ہی دفع میں ان سے مل کر ان کی شخصیت کا اسیر ہو گیا تھا۔ وہ خوبرو سے، درمیانی عمر کے آدمی تھے۔ ان کی شخصیت کا ایک منفرد سا رعب و دبدبہ تھا جس نے رمیص کو اپنی جانب کھینچا تھا۔۔۔اس کے بعد کافی بار اس کی ان سے ملاقات ہوتی رہی تھی۔

ایک سال کے عرصے بعد فیضان واپس لوٹا تو اس نے بھی دوبارہ سے چینل جوائن کر لیا۔

رمیص، فیضان، رؤوف صاحب اور اصغر۔۔۔ان چاروں کا ایک گروپ سا بن گیا تھا۔۔۔ہر چیز میں ایک ساتھ، ہر کام میں ہمراہ وہ چاروں ایک دوسرے کا سہارا بن گئے تھے۔

www.novelsclubb.com

رمیص کی زندگی کا سرکل نہایت مختصر سا تھا۔ محض چند ہی لوگوں کے گرد گھومتا تھا۔ یا شاید یہ کہنا زیادہ بہتر ہو گا کہ دنیا میں اسے محض چند لوگوں پر ہی بھروسہ تھا۔

اس کے دونوں ماموؤں نے کئی کوششیں کی تھیں ان دونوں کو دبانے کی مگر ان کو شاید اندازہ نہیں تھا کہ جس طرح حالات ایک سے نہیں رہتے، ویسے ہی انسان بھی ایک سے نہیں رہتے۔ حالات بدلتے بدلتے ساتھ میں انسان کو بھی بدلتے جاتے ہیں۔ وہ دونوں بھی بدل گئے تھے۔ ان کی شخصیت کا وہ ڈرا سہما سا وجود اب ڈھے گیا تھا۔ اس وجود کی جگہ مضبوطی کے دو مجسمے ابھرے تھے جو آسانی سے نہیں چیخ سکتے تھے۔ جو آسانی سے نہیں ٹوٹ سکتے تھے۔

رمیص نے اپنی مختصر سی زندگی میں ایک طویل سفر طے کیا تھا۔ اٹھارہ سال کی عمر میں ایک انسان کی ذمے داری اس کے کمزور شانوں پر پڑی تھی تو اس کا وجود گھبرایا ضرور تھا، مگر ہمت نہیں ہارا تھا۔ ماموں سے ایک روز کافی تلخ کلامی ہونے پر یونہی ایک روز زید نے اس سے پوچھا تھا۔

"آپ خاموش کیوں نہیں کر جاتے ان کے سامنے؟ چاہے جو بھی ہوا، ہیں تو وہ بڑے ناں۔۔۔ اور سب سے بڑھ کر ہمارے ماموں بھی تو ہیں۔۔۔ دنیا میں ماموؤں کے علاوہ کوئی دوسرا خونی رشتہ بھی تو نہیں ہے ہمارے پاس۔"، وہ اس وقت آفس کا کام کرنے لیپ ٹاپ کے سامنے بیٹھا تھا۔۔۔ زید کی بات پر سر اٹھا کر اسے سنجیدہ نظروں سے دیکھا اور پھر ایک گہرا سانس لیتا، لیپ ٹاپ سائیڈ پر رکھ کر اس کی جانب پوری طرح سے متوجہ ہوا۔

"زید، ایک بات میری ہمیشہ یاد رکھنا۔۔۔ ایک انسان میں اتنی ہمت تو ہونی چاہیے کہ وہ صحیح کو صحیح اور غلط کو غلط کہہ سکے۔۔۔ عمل کرنا یا نہ کرنا بعد کی جھنجھٹ ہے۔۔۔ مگر اس میں اتنا حوصلہ تو ہونا چاہیے کہ وہ سینہ تان کر جھوٹ کے سامنے کھڑا ہو کر، اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہہ سکے کہ وہ غلط ہے۔ غلط کو صحیح کہہ دینے سے وہ صحیح ہو تو نہیں جائے گا ناں؟"، وہ اپنے سنجیدہ متوازن انداز میں دھیمے مگر مضبوط لہجے میں کہتا جا رہا تھا اور زید خاموش سا اس کو تکتا جا رہا تھا۔ الفاظ ختم ہو گئے تھے یا کہیں اٹک کر رہ گئے تھے، وہ فیصلہ نہیں کر پایا تھا۔۔۔ اور

اس روز زید کو اس بات کا اندازہ ہوا تھا کہ الفاظ سے سامنے والے کو چت کرنے کا اگر کوئی ہنر وجود رکھتا ہے تو وہ رمیص میں کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ اس کے الفاظ میں ایک منفرد سی تاثیر تھی۔ ایک الگ سا دبدبہ جو اگلے انسان کو سن کر دیتا تھا۔

پڑھائی مکمّل ہوتے ہی رمیص نے جرنلزم میں باقاعدہ قدم رکھا تھا۔ اور آتے ہی جیسے اس نے دھوم مچا دی تھی۔ محض چند شوز میں ہی اس کی شہرت بلندیاں چھونے لگی تھی۔ وہ عوام میں مقبول و محبوب بن گیا تھا۔ وہ ان کی آواز تھا۔ ان کے حق میں کی جانے والی ہر کوتاہی پر سینہ تان کر لڑتا تھا۔ ایسا کوئی گھر نہیں تھا جہاں اس کا چرچہ نہ ہو۔۔۔ہاں کچھ لوگ ایسے بھی تھے جن کو وہ ایک آنکھ نہیں بھاتا تھا۔ وجہ اس کی بے خوفی تھی۔ صاف گوئی تھی۔ مگر ان لوگوں کے کسی خیالات کا اس پر کوئی اثر نہیں تھا۔

انہی دنوں اسے ایک لڑکی ملی تھی۔۔۔ ہیزل رنگ آنکھوں والی۔۔۔ پر وقار شخصیت کی مالک۔۔۔ وہ ہر کسی کو نہیں دیکھ لیتی تھی۔ نہ ہر کسی سے مخاطب ہو جایا کرتی تھی۔ وہ خود کو اور

اپنے وقار کو اہمیت دیتی تھی۔ رمیص کی نظر پہلی بار اس کی جانب اٹھی تھی تو کچھ ہی دیر میں اس کی شخصیت کے نور سے جھک گئی تھی۔ کچھ ایسا تھا اس لڑکی میں۔

اسے وہ ایک لائبریری میں ملی تھی۔

وہ شام اس کی زندگی کی سب سے حسین شاموں میں سے ایک تھی۔ وہ لائبریری ایک کتاب واپس کروانے گیا تھا۔ مغرب طلوع ہونے کو تھی۔ ہلکا جامنی سا آسمان نظروں کو خیرہ کر دینے کی حد تک حسین لگ رہا تھا۔ دن کی زردی شام کی جامنی سی نیلاہٹ میں گڈمڈ ہونے لگی تھی۔ وہ لائبریری کا دروازہ دھیرے سے کھول کر اندر بڑھ آیا تھا۔ ہاتھ میں تھامی کتاب اس نے شیلف میں رکھی تھی اور پھر یونہی دوسری کتاب اٹھائے ورق پلٹنے لگا تھا کہ اسے عین اپنے مقابل کافی فاصلے سے رکھی میز کے اس پار ایک لڑکی بیٹھی نظر آئی تھی۔ اس لڑکی نے آنکھیں بند کر رکھی تھیں اور وہ مسلسل سبق دہرانے کے سے انداز میں آگے پیچھے جھول رہی تھی۔

www.novelsclubb.com

چہرہ پورا نقاب میں چھپا تھا۔ محض بند آنکھیں ہی نظر آتی تھیں۔ رمیص لاشعوری طور پر اسے دیکھے گیا تھا۔ جبھی اس نے آنکھیں کھولی تھیں۔ رمیص نے گڑبڑا کر چہرہ ہاتھ میں تھامی کتاب پر جھکایا تھا۔ وہ اس سے کافی فاصلے پر کھڑا تھا مگر اس کا نخوت سے سر جھٹکنا اس نے کن اکھیوں سے دیکھا تھا۔۔۔ اور نجانے کیوں اسے ہنسی آئی تھی۔ وہ دھیرے سے چلتا ہوا لائبریرین کے پاس آ کھڑا ہوا تھا۔ لائبریرین کی ڈیسک سے وہ قریب سے نظر آ رہی تھی۔ اسے ایک آخری نظر دیکھ کر رمیص نے ہاتھ میں تھامی کتاب لائبریرین کی جانب بڑھائی تھی۔

"ایشو کروانی ہے۔" اس نے کہا تو لائبریرین سر ہلا کر کارڈ پر کرنے لگی۔ رمیص نے چہرہ واپس نہیں پھیرا تھا۔ اسے برا لگ رہا تھا یوں کسی لڑکی کو دیکھنا۔۔۔ اور وہ بھی تب جب وہ لڑکی اس چیز کو ناپسند کر رہی ہو۔ کتاب ایشو کر دی گئی تو وہ کتاب پکڑے مڑا ہی تھا کہ ایک جھٹکے سے رکا۔ وہ اس سے صرف کچھ ہی قدموں کے فاصلے پر تھی۔ اگر وہ بے دھیانی میں دو قدم بھی

آگے بڑھاتا تو ان کی ٹکر یقینی تھی۔ تبھی اس لڑکی نے نگاہیں ایک پل کو اٹھا کر اسے دیکھا تھا اور پھر سر جھٹکتی وہ لائبریرین کے ڈیسک کی اگلی جانب چلی گئی تھی۔

مگر اس ایک لمحے میں اس نے اس لڑکی کی آنکھیں دیکھی تھیں۔ان کا رنگ ہیزل تھا۔ آنکھوں کی پتلیوں کے گرد ہلکی بھوری زرد و سنہری سی لکیریں بہت واضح نظر آتی تھیں۔ جیسے انہیں نہایت فرصت سے بیٹھ کر سجایا گیا ہو۔اس کی سیاہ گھنگھور پلکوں کے نیچے وہ چمکتی ہوئی بھوری مائل سبز آنکھیں کچھ پل کے لیے اس کو ساکت کر گئی تھیں۔اس نے آج سے پہلے اتنی حسین آنکھیں کبھی نہیں دیکھی تھیں۔وہ کب لائبریری سے باہر نکل آیا،اسے علم نہ ہوا۔۔۔ آنکھوں کے پردے کے سامنے بار بار وہ ہیزل آنکھیں لہرا رہی تھیں۔۔۔یوں جیسے وہ اس کے ذہن کے کسی دریچے میں نقش ہو کر رہ گئی ہوں۔یوں جیسے انہیں جھٹک دینا اس کے لیے ممکن نہ ہو۔

***

مانچسٹر میں واقع ایک اسکول کے خارجی دروازے کے پاس ضوفشاں منتظر سی کھڑی تھی۔ سیاہ رنگ کا گھٹنوں سے نیچے تک آتا اوور کوٹ پہنے، بالوں کو بھورے رنگ کی چھوٹی شال سے ڈھکے، وہ جیبوں میں ہاتھ ڈالے کھڑی تھی۔ نگاہیں اندر کو جاتے راستے پر جمی تھیں۔ جبھی ایک تیز گھنٹی کے بجتے ہی چند ہی لمحوں میں بچے ہنستے کھلکھلاتے باہر آنے لگے۔ انہی بچوں کے بیچ اسے سست روی سے چلتی اپنی بیٹی نظر آئی تھی۔ گہرے نیلے رنگ کا یونیفارم پہنے، شانوں پر بستہ لٹکائے، وہ تھکے ہارے انداز میں چلتی ہوئی اسے دیکھتی، اسی کی جانب آ رہی تھی۔ ضوفی اسے دیکھ کر خوش دلی سے مسکرائی تھی۔

" کیسا گیا ایگزام میری بے بی کا؟"، اس نے بستہ اس کے شانوں سے اتار کر اپنے ایک شانے پہ لٹکاتے ہوئے پوچھا تو ایمل نے چہرہ اٹھا کر اسے دیکھا۔

"اچھا نہیں ہوا، مما۔ "، اس نے افسردگی سے کہا تو ضوفی کو حیرت ہوئی۔

"ہیں ؟اچھا کیوں نہیں ہوا؟ آپ نے تو بہت تیاری کی تھی۔"،اب وہ اس کی انگلی تھامے مین گیٹ کی جانب بڑھ گئی تھی۔ ایمل چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی، سر جھکائے اس کے ساتھ ہی چل رہی تھی۔

"پتا نہیں۔۔۔ سب کچھ یاد ہے مگر ایگزام ہال میں بیٹھتے ہی سب بھول گئی تھی میں۔۔۔ابھی مجھ سے پوچھیں گی تو سب سنادوں گی آپ کو۔"،وہ عجیب غائب دماغی کے عالم میں بولی تو ضوفی نے نگاہیں جھکا کر یونہی اسے دیکھا تھا۔ وہ اسے نہیں دیکھ رہی تھی۔ وہ چلتے چلتے اپنے جوتوں میں مقید پیروں کو دیکھ رہی تھی۔ اس کی چال نہایت سست تھی۔ سر ڈھلکانے کا انداز بھی تھکا تھکا سا تھا۔ تبھی ضوفی یونہی اس کا ہاتھ تھامے قریب رکھی ایک بینچ تک چلی آئی تھی۔ پھر شانوں سے پکڑ کر اسے بینچ پر بٹھایا۔۔۔وہ اسے ہی دیکھ رہی تھی۔ اب ضوفی گھٹنوں کے بل اس کے عین سامنے بیٹھی اور اس کے ننھے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں مقید کیے۔

"کیا ہوا ہے، مما کی جان؟"، وہ اب بہت نرمی سے مدھم لہجے میں اس سے پوچھ رہی تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے ایمل کی ہیزل آنکھیں جھلملا گئی تھیں۔ موٹے موٹے آنسو آنکھوں میں تیرتے کسی بھی لمحہ بہنے کو تیار تھے۔ ضوفی کا دل یکدم ہی پسیجا تھا۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر اس کی آنکھیں پونچی تھیں پھر نرمی سے اس کی ٹھوڑی پکڑی تھی۔

"مما کو بتاؤ، ایمل۔۔۔ کیا ہوا ہے؟"، اس کے پوچھنے پر ایمل چند پلوں تک اسے دیکھتے رہنے کے بعد آگے بڑھ کر یکدم ہی اس کے گلے آ لگی تھی۔ ضوفی ہکا بکا سی بیٹھی رہ گئی تھی۔ اب ایمل اس کے گرد بازو لپیٹے سسک سسک کر کہنے لگی تھی۔

"مجھے پاپا نہیں پسند، مما۔۔۔ وہ آپ کو ڈانٹتے ہیں۔ آپ کو مارتے ہیں۔ آپ پر چیختے ہیں۔۔۔ مجھے وہ نہیں پسند بالکل بھی!"، وہ گہرے گہرے سانس لیتی آنسوؤں کے درمیان بے بسی سے کہہ رہی تھی۔۔۔ اور اس سے بھی زیادہ بے بس ہوئی بیٹھی ضوفی زلزلوں کی زد میں آ چکی تھی۔ نصیر ایمل کے سامنے کبھی نہیں جھگڑتا تھا۔ اس دنیا میں اگر کوئی واقعتاً نصیر کو عزیز تھا تو وہ اس

کی بیٹی تھی۔ وہ سب برداشت کر سکتا تھا مگر یہ کبھی برداشت نہیں کر سکتا تھا کہ اس کی ہر دل عزیز بیٹی کی نظر میں اس کا مقام گر جائے۔ وہ ایمل کے سامنے ہمیشہ یہی ظاہر کیا کرتا تھا کہ ان کی فیملی پرفیکٹ، ہیپی فیملی ہے۔ مگر نجانے کہاں اس سے بھول ہو گئی تھی کہ آج وہی بیٹی اس کے لیے ناپسندیدگی کا اظہار کر رہی تھی۔ ضوفشاں نے ایمل کو شانوں سے تھام کر نرمی سے پیچھے کیا تھا اور پھر اس کے چہرے کو اپنے ہاتھوں میں بھرا تھا۔

"ایمل، آپ نے بابا کے سامنے ایسی کوئی بات نہیں کرنی۔۔۔وہ آپ سے کتنا پیار کرتے ہیں ناں۔ آپ کا کتنا خیال رکھتے ہیں۔"، ابھی وہ نرمی سے دھیرے دھیرے اسے مزید کہنے ہی لگی تھی کہ ایمل کے اگلے الفاظ نے اس کی رہی سہی ہمت بھی نچوڑ لی تھی۔

"تو کیا وہ آپ سے پیار نہیں کرتے؟ کیونکہ وہ آپ کا خیال تو نہیں رکھتے۔۔۔"، وہ تو بول کر منتظر سی اس کے جواب کا انتظار کرنے لگی تھی، مگر ضوفشاں کے دل نے دھڑکنوں کی رفتار نہایت مدھم کر لی تھی۔ وہ بے اختیار ڈھے جانے کے سے انداز میں کچھ پیچھے ہوئی تھی۔

"نہیں،ایسا تو نہیں ہے۔"،وہ ایمل سے نہیں کہہ رہی تھی۔وہ خود سے کہہ رہی تھی۔خود کو یقین دلا رہی تھی کہ نہیں!ایسا کیسے ممکن ہے کہ وہ اس سے پیار نہ کرتا ہو؟مگر پھر ایک کے بعد ایک ہر وہ لمحہ اس کی نگاہوں کے آگے ہائی لائٹس کی مانند چلتا گیا تھا جب نصیر نے کافی اچھے سے باور کروادیا تھا کہ اسے اس کی ذات بے وقعت و بے مول لگتی تھی۔اس کے ہونے نہ ہونے سے نصیر کی زندگی پر نہ کوئی فرق پڑا تھا نہ پڑ سکتا تھا۔اذیت روح میں گھلنے لگی تھی۔ تکلیف کی اٹھتی ٹیسیں پورے جسد کو جیسے مفلوج کرنے لگی تھیں۔بمشکل ایمل کا ہاتھ تھامے وہ کھڑی ہوئی تھی اور پھر نجانے کیسے مرے مرے قدموں سے وہ گھر پہنچی تھی۔

دماغ میں جھکڑ چل رہے تھے اور دل میں درد کی لہریں اٹھ رہی تھیں۔یہ کیسی اذیت تھی،یا رب؟

***

رات کے پہر گھر کی تمام بتیاں بجھادی گئی تھیں۔ تقریباً سب ہی اپنے اپنے کمروں کی جانب جا چکے تھے۔ ایسے میں ایمان اپنے کمرے میں بستر پر چت لیٹی ایک بار پھر چھت کو دیکھ رہی تھی۔ موسم ایسا تھا کہ رات کو خاصی ٹھنڈ ہو جاتی جبکہ دن میں گرمی کا زور رہتا۔ وہ آج بڑی خاموش دکھتی تھی۔ آج اس کی آنکھیں بھی نہیں بہہ رہی تھیں۔ بس ایک سکوت سا تھا جس نے اس کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا۔ جبھی سائیڈ ٹیبل پر رکھا اس کا موبائل تھرتھرایا تو توجہ یکدم ہی اس کی جانب مبذول ہوئی۔ اسکرین روشن ہوئی تو سامنے فاطمہ کا جگمگاتا پیغام نظر آیا۔

نہایت نرم مسکراہٹ نے یکدم ہی اس کے لبوں کا احاطہ کیا تھا۔ اس نے موبائل پکڑے اس کی چیٹ کھولی تھی۔

www.novelsclubb.com

"جاگی ہوئی ہو؟"

ایمان لاشعوری طور پر مسکرانے لگی تھی۔

"ہاں۔۔۔ کیسی ہو؟"، اس نے ٹائپ کر کے بھیجا تو چند ہی پلوں بعد فاطمہ کا اگلا مسج آیا۔

"ٹھیک ہوں۔ تم کیسی ہو؟ یونیورسٹی کیسی جا رہی ہے؟"

ایمان مسکرا کر اس کو حال احوال بتانے لگی کہ چند پلوں بعد آنے والے ایک مسیج پر اس کی آنکھیں ساکت سی ہوئی تھیں۔

"ابا نے گھر امی کے نام کر دیا، ایمان۔"

ایمان یکدم ہی بستر پر اٹھ بیٹھی تھی۔

"کیا کہہ رہی ہو یہ؟ کیا واقعی؟"، فاطمہ سے اب اس کی تقریباً روزانہ ہی بات ہوا کرتی تھی۔ امی سے بھی۔ اسے وہاں چلتے تمام معاملات کی خبر تھی۔

"ہاں۔۔۔ آج پورے دو ہفتے بعد وہ یہاں آئے تھے۔ کاغذات بھی لائے تھے۔ انہوں نے گھر امی کے نام کر دیا ہے۔۔۔ اب کل ہم واپس چلے جائیں گے وہاں۔"، نجانے کیسے مگر ایمان سمجھ گئی تھی کہ فاطمہ بہت خوش ہے۔

www.novelsclubb.com

"تم مجھے کچھ بتانا چاہتی ہو، فاطمہ؟"، اس نے یکدم ہی مسیج کیا تو اگلے پل بستر پر لیٹی فاطمہ مسکرائی تھی۔ پھر اس نے وائس نوٹ ریکارڈ کرنا شروع کیا۔ رضیہ کے برابر میں سونے کے باعث وہ بہت مدھم آواز میں بول رہی تھی۔

"ابا نے امی سے آج کہا کہ وہ تمہیں واپس بلا لیں۔۔۔ اور یہ بھی کہا کہ اب سے وہ تمہیں کبھی کچھ نہیں کہیں گے۔ نہ ڈانٹیں گے، نہ تذلیل کریں گے۔۔۔ اور تو اور یہ بھی کہا کہ وہ تمہاری پڑھائی بھی مکمل کروائیں گے۔۔۔ امی کل تمہیں کال کریں گی، ایمان۔۔۔ یا اللہ! میں بتا نہیں سکتی کہ میں کتنی خوش ہوں۔"

فاطمہ کی پر جوش آواز سن کر نجانے کیوں اس کی آنکھوں میں ایک سرخی سی ابھری تھی۔ یکدم ہی آنکھیں جلنے لگی تھیں۔ ایک گہرا سانس لے کر اس نے کھنکار کر بولنا شروع کیا تھا۔

"میں یہاں ٹھیک ہوں، فاطمہ۔ مجھے وہاں نہیں آنا۔۔۔ امی سے کہو کہ مجھے فون کریں تو یہ بات نہ کریں مجھ سے۔۔۔ بہت مشکلوں سے مجھ میں اعتماد آنے لگا ہے۔۔۔ میں اس اعتماد کو پھر

سے کرچی کرچی نہیں کرنا چاہتی۔۔۔اور ویسے بھی، مجھے کسی کے رشتہ جڑنے کی شرط نہیں بننا۔۔۔میں جانتی ہوں کہ یہ امی کی شرط ہے۔۔۔وہ آخری شرط جس کے بدلے وہ گھر واپس جائیں گی۔۔۔مگر مجھے خود اور اپنے ذہنی سکون کو کسی شرط کی بھینٹ نہیں چڑھانا۔۔۔میں یہاں ٹھیک ہوں۔"

وہ تو بول کر خاموش ہو گئی تھی مگر اگلی جانب فاطمہ کی ساری خوشی پر پانی پھر گیا تھا۔وہ اتنی سنگدل کیوں ہو گئی تھی؟ کیا اسے اپنوں کی یاد نہیں آتی تھی؟ کیا وہ اتنی جلدی انہیں فراموش کیسے آگے بڑھ گئی تھی؟

"تمہیں ہماری یاد نہیں ستاتی کیا؟"نہایت ٹوٹے انداز میں اس کا اگلا مسج ابھرا تو ایمان کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔

"کیا ایسا ممکن ہے؟"،اس نے مسج بھیج کر اپنی آنکھوں میں در آئی گرم نمی کو پونچا تھا۔وہ اسے کیسے بتاتی اپنے دل کا حال؟ یہ دنیا کا مشکل ترین کام لگتا تھا۔

"لگتا تو یہی ہے کہ ممکن ہے۔"،فاطمہ کے ناراضگی سے کہنے پر ایمان نے ایک نم سانس خارج کیا تھا۔اور پھر وائس نوٹ ریکارڈ کیا تھا۔

"سب یاد آتے ہیں۔ گھر بھی یاد آتا ہے۔ حیدرآباد بھی یاد آتا ہے۔۔۔ مگر جانتی ہو،فاطمہ؟ اس سب کے ساتھ اور کیا یاد آتا ہے؟"،اور اب وہ مزید ضبط نہیں کر پائی تھی۔ نمی آنسو بن کر آنکھوں سے آزاد ہو گئی تھی۔ "وہ تذلیل،وہ تضحیک،وہ احساس کمتری،وہ اذیت،وہ تکلیف۔۔۔اور یقین کرو،فاطمہ۔۔۔یہ سب سہنا مجھ جیسی کمزور انسان کے لیے بہت مشکل ہوتا ہے۔ میں وہاں رہی تو گھٹتے گھٹتے جلد ہی مر جاؤں گی۔یہاں رہی تو شاید زندہ بچ جاؤں۔ تم مجھے زندہ نہیں دیکھنا چاہتی کیا؟"،اس کی دبی دبی سسکیاں کمرے کی در و دیوار سے پلٹ پلٹ کر سنائی دیتی تھیں۔ اگلی جانب اس کے الفاظ سن کر فاطمہ کا دل سکڑا تھا۔ وہ صحیح کہہ رہی تھی۔ وہ مظلوم تھی۔ وہ ہمیشہ سے مظلوم ہی تو تھی۔

وہ اپنے حق میں جب بھی کہتی تھی، صحیح ہی تو کہتی تھی۔ زیادتی وہ کہاں کرتی تھی؟ زیادتیاں تو اس کے ساتھ سب کرتے تھے۔۔۔اس کا فیصلہ صحیح ہی تو تھا۔ اس کا کہا ہر حرف سچ ہی تو تھا۔

اس کے بعد اس کی کچھ کہنے کی ہمت نہیں ہوئی تھی۔ اللہ حافظ کہہ کر وہ کروٹ بدل کر لیٹ گئی تھی۔ دماغ میں ایمان کی کہی باتیں گونج رہی تھیں۔ نجانے نیند کب آنی تھی؟

اگلی جانب ایمان خاموش آنسو بہاتی موبائل سائیڈ ٹیبل پر رکھ کر پھر سے لیٹ گئی تھی۔ اس اذیت کو بھلانا مشکل تھا۔ مگر اس سے زیادہ مشکل اسے یاد کرنا تھا۔ اس اذیت کو یاد کرنے پر ہر بار دل سے خون رستا تھا۔ ہر بار تکلیف نئے سرے سے عود کر آتی تھی۔ اور اسی طرح، پچھلی تمام راتوں کی طرح اس کی یہ رات بھی آنسوؤں میں گزری تھی۔ شاید سکون کی نیند اس سے روٹھ گئی تھی!

***

آج وہ میرال سے ملنے آئی ہوئی تھی۔ آخری بار وہ اس سے تب ہی ملی تھی جب وہ کیفے میں ملے تھے۔ موبائل پر تو بات چیت ہو رہی تھی مگر ملاقات کا موقع آج ہاتھ آیا تھا۔ یہ ایک ریستوران کی بالائی منزل تھی جسے بہت سی لائٹوں سے خوبصورتی سے سجایا گیا تھا۔ وہ دونوں گیلری کے برابر میں بیٹھی تھیں۔ گیلری سے شام کا حسین منظر خوب حسین لگتا تھا۔ مغرب میں چند ہی ساعتیں باقی تھیں۔ رات کے جامنی آسمان اور دن کی ڈھلتی نارنجی روشنی کا ملاپ حسین ترین لگتا تھا۔ یوں جیسے کسی نے کینوس پر رنگ بکھیر دیے ہوں۔

گہرے جامنی رنگ کی لانگ فراک کے ساتھ سفید دوپٹہ اور چوڑی دار پاجامہ پہنے، ایمان خود کو سنہری شال سے ڈھکے ہوئی تھی۔ سر پر اوڑھے دوپٹے کی اوٹ سے اس کی دو سیاہ لٹیں نکل کر رخساروں پر جھول رہی تھیں۔ اس کے مقابل بیٹھی میرال بھورے رنگ کے کرتا شلوار کے ساتھ بھورا ہی اسٹالر حجاب کی صورت لپیٹے ہوئی تھی۔ اس کی سبز آنکھیں مسکرا رہی تھیں۔ چہرہ کھلا کھلا لگتا تھا۔

"پتا ہے، ایمان؟ پہلے کامل نے کہا کہ نکاح ایک مہینے کی تاخیر سے کرتے ہیں تو مجھے بہت گھبراہٹ ہوئی تھی، غصہ بھی آیا تھا۔۔۔ مگر کل اس نے ایک ایسی بات کی کہ میرا دل یکدم مطمئن ہو گیا۔"، پیزا کا سلائس ہاتھ میں پکڑتے ہوئے وہ مسکراتی آنکھوں سے کہنے لگی تو ایمان اسے منتظر سی سننے لگی۔

"اس نے کہا کہ جہاں اتنے سال کچھ اثر نہ ڈال سکے، وہاں یہ ایک ماہ کیا اثر ڈالے گا، میرال؟ محبت آج تک ویسی ہی رہی تو ایک اور ماہ کی تاخیر کیا کچھ بگاڑ سکتی ہے؟"

ایمان کو سمجھ نہیں آیا تھا کہ اس بات میں ایسا کیا مطلب تھا کہ مسکراہٹ اس کے لبوں سے جدا ہی نہیں ہو رہی تھی۔

"وہ تو صحیح ہے مگر اس میں مسکرانے کی کیا بات ہے؟ چاہے اثر نہ بھی پڑتا ہو، مگر نکاح میں دیر تو ہو رہی ہے ناں؟"، وہ کنفیوژن سے بولی تو میرال ہنس پڑی۔

www.novelsclubb.com

"ارے اطمینان اس بات پر نہیں ہے کہ نکاح پوسٹپانڈ ہو گیا۔۔۔اطمینان اس چیز کا ہے کہ ہمارے درمیان کئی سال آئے۔۔۔ مگر کوئی شے ہمارے جذبات پر ضرب نہ لگا سکی۔۔۔جانتی ہو ایمان؟ ایک وقت میں میں سوچتی تھی کہ کامل میری بچپن کی ایٹریکشن ہے بس۔۔۔ پھر جب مجھے اس بات کا احساس ہوا کہ وہ ایٹریکشن سے کئی زیادہ ہے تو میرے دل میں ایک خوف بیٹھ گیا۔۔۔ کہ ایسا نہ ہو کہ وہ مجھے نہ پسند کرتا ہو۔۔۔ میں نے دو سال اس سے اپنے جذبات چھپائے رکھے۔۔۔"،اس نے ایک گہرا سانس فضا کے سپرد کر کے نم مسکراتی آنکھوں سے ایمان کو دیکھا تھا۔ "مگر میں تو اس بات سے بے خبر تھی،ایمان۔۔۔ کہ وہ تو ان احساسات کو بنا لفظوں کے ہی محسوس کر لیا کرتا تھا اور مجھے اندازہ بھی نہیں ہوتا تھا۔جب مجھے اس کی بیماری کی خبر ہوئی تھی تو جانتی ہو کیا ہوا تھا؟"،اس کے پوچھنے پر ایمان نے ہولے سے نفی میں سر ہلایا تھا۔ میرال کی آنکھوں کی نمی میں اضافہ ہوا تھا۔ وہ اس نمی کے ساتھ بھی مسکرائی تھی۔ اس کی بات بات پر مسکرانے والی عادت کبھی نہیں جانی تھی۔

(نکاح کی خوشی میں روحان نے اپنے گھر پر ان سب کی دعوت رکھی تھی۔ چھت پر بار بی کیو کا انتظام کیا گیا تھا۔ ابھی تک رضا اور ایمان نہیں آئے تھے جبکہ روحان نیچے سے کچھ سامان لینے گیا تھا۔ کامل اور میرال چھت پہ لگی کرسیوں میں سے دو پر بیٹھے تھے۔ میرال ہلکے سبز رنگ کی سادہ سی قمیض شلوار میں ملبوس تھی۔ ہم رنگ دوپٹہ اسٹالر کی صورت گردن کے گرد لپیٹ رکھا تھا۔ اس سے کچھ ہی فاصلے پر کامل بیٹھا تھا۔ سفید رنگ کے سادہ شلوار قمیض پہنے، وہ اب سے کچھ چھوٹا اور پژمردہ سا لگتا تھا۔ سیاہ بال ماتھے پر بکھیر رکھے تھے۔۔۔ جبکہ آنکھوں میں وہ چمک کہیں نظر نہ آتی تھی جو اس کی شخصیت کا سب سے نمایاں پہلو تھی۔

میرال نے ایک نظر اٹھا کر اسے دیکھا تھا۔ وہ چہرہ ذرا سا اٹھائے سلگتے کوئلوں کو دیکھ رہا تھا۔ وہ چند لمحات تک اسے دیکھے گئی تھی۔ اس کے بے رونق چہرے پر اسے نجانے ایسی کون سی اپنائیت نظر آتی تھی جو نگاہیں ہٹانا مشکل ہو جایا کرتا تھا۔ جبھی کامل کی نظریں بھٹک کر اس کے چہرے پر آٹھہری تھیں۔ اسے خود کو دیکھتا پا کر وہ نرمی سے مسکرایا تھا۔

"کیا ہوا؟"۔ مسکرا کر سر جھٹکتا وہ چہرہ جھکائے اب اپنی انگلیاں چٹخانے لگا تھا۔

"کچھ نہیں!"۔ میرال نے دھیرے سے کہہ کر سر نفی میں ہلایا تھا۔۔۔دل کی دھڑکنوں نے بہت تیز رفتار پکڑی تھی۔ لگتا تھا کہ دل سینے سے نکل کر باہر آ دوڑے گا۔ جبھی اس کی سماعت سے کامل کی مدھم سی آواز ٹکرائی تھی۔

"تمہیں کبھی محبت ہوئی ہے، میرال؟"۔وہ سر اٹھائے اسے دیکھتا بہت دھیمے انداز میں پوچھ رہا تھا۔ ساتھ اس کی آنکھوں میں بھی جھانک رہا تھا۔۔۔ جیسے کچھ کھوجنا چاہتا ہو، کوئی سچ، کوئی راز، کوئی جذبہ، کوئی احساس۔

www.novelsclubb.com

میرال کا دل زوروں سے دھڑکا تھا۔ وہ خاموش آنکھوں سے اسے دیکھے گئی تھی۔ نہ کچھ کہنے کی ہمت ہوئی نہ کوئی رد عمل دینے کی۔ وہ کافی پل اس کے جواب کا منتظر رہا تھا، پھر دھیرے سے افسردگی سے مسکرایا تھا۔

"جانتی ہو؟ مجھے ہوئی ہے محبت۔"،اور یہاں میرال کی آنکھیں جھلملائی تھیں۔انگیٹھی میں رکھے کوئلے زوروں سے سلگ اٹھے تھے۔دل ڈوب کر ابھرا تھا۔رقابت کے احساس سے ایک ابال سا اٹھا تھا۔وہ اب بھی آہستہ آہستہ کہتا جا رہا تھا۔"ایک لڑکی ہے۔۔۔سبز آنکھوں والی۔"

اور رفتہ رفتہ اس کا مچلتا جسم ساکت پڑا تھا۔وہ بے حرکت وجود لیے اسے تکے گئی تھی۔وہ اب بھی کہتا جا رہا تھا۔

"بہت حسین روح و قلب کی مالک۔۔۔میری بچپن کی ساتھی۔"، جھلمل کرتی آنکھیں اب اشک بہانے کو بے تاب تھیں۔کامل کی آنکھوں میں بہت سے جذبات گڈمڈ ہوتے نظر آ رہے تھے۔وہ ساکت سی اسے ہی دیکھ اور سن رہی تھی۔

"وہ مجھ سے محبت کرتی ہے، میرال۔۔۔مگر وہ نہیں جانتی کہ میں شروع سے اس کی پسندیدگی کے بارے میں جانتا ہوں۔ان گنت بار اس کی آنکھیں پڑھ چکا ہوں۔"، میرال کی تیز ہوتی دھڑکنیں رفتہ رفتہ سست پڑنے لگی تھیں۔کان لوؤں تک سرخ ہو کر دہک رہے تھے۔

"مگر آنکھیں پڑھنے میں وہ تھوڑی کچی ہے۔یا بے یقینی سب سے بڑھ کر ہے اس میں۔ وہ شاید چاہ کر بھی یقین نہیں کر پاتی کہ میں اس سے محبت کرتا ہوں۔"

کامل چپ ہوا تو سارے میں جیسے سناٹا چھا گیا۔ وہ دونوں اپنی دھڑکنوں کی آوازیں واضح طور پر سن سکتے تھے۔

"وہ لڑکی تم ہو، میرال۔"، وہ بولا تو بعد میں تھا۔ میرال کی سسکی پہلے بلند ہوئی تھی۔ نہایت بے یقینی سے وہ منہ پر ہاتھ رکھے اپنی سسکیوں کا گلا گھونٹنے کی جدوجہد کر رہی تھی۔ "مگر میں تم سے آج اعتراف کے ساتھ ساتھ معذرت بھی کرنا چاہتا ہوں۔"

میرال نے گلابی پڑتی سبز آنکھوں سے اسے ناسمجھی سے دیکھا تھا۔

"مجھ سے موو آن کرلو، میرال۔ تم میرے لیے نہیں بنی۔ تم کسی بہت اچھے پرفیکٹ انسان کو ڈیزرو کرتی ہو۔۔۔ مجھ جیسے مفلوج انسان سے تمہیں کبھی کچھ حاصل نہیں ہوگا۔"، وہ نہایت مدھم انداز میں بولا تو وہ تڑپ سی گئی۔

"کیوں کر رہے ہو ایسی فضول باتیں؟"

"فضول باتیں نہیں ہیں یہ۔۔۔ حقیقت ہے۔ کچھ ہی عرصے میں مر جاؤں گا میں۔۔۔ میری زندگی تھوڑی ہی رہ گئی ہے، میرال۔ میں تمہیں اپنے ساتھ تباہ نہیں کرنا چاہتا۔"، وہ گردن جھکائے، نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہتا جارہا تھا۔ آنسو ٹپ ٹپ اس کی آنکھوں سے بہتے جارہے تھے۔ کافی عرصے کی چپ اور خاموشی تھی جو آج لفظوں کے ساتھ ساتھ آنسوؤں کے ذریعے بھی باہر آرہی تھی۔

"کیا کہہ رہے ہو یہ؟ مجھے کچھ سمجھ نہیں آرہا۔"

"لنگ کینسر ہے کامل کو، میرو۔"، کوئی سیڑھیاں چڑھتے بولتے ہوئے اوپر آیا تھا۔ وہ اس کی آواز پہچانتی تھی مگر جھٹکا ایسا شدید تھا کہ دماغ سائیں سائیں کرنے لگا تھا۔ روحان اب چلتا ہوا اوپر چلا آیا تھا۔ اب وہ کامل کے برابر میں بیٹھ گیا تھا۔ میرال صرف کامل کو دیکھ رہی تھی۔ وہ ششدر تھی۔ ساکت!

www.novelsclubb.com

کامل نگاہیں چرا رہا تھا۔ اس کے پاس کرنے کو اور کچھ نہیں تھا۔

"ک۔۔۔ کیا کہہ رہے ہو یہ؟"۔شاید اسے سننے میں غلطی ہوئی تھی۔ ورنہ یہ سچ کیسے ہو سکتا تھا؟ ایسا کیسے ممکن تھا؟

" صحیح کہہ رہا ہوں۔۔۔ مگر ہمیں پورا یقین ہے کہ یہ انشاءاللہ بالکل ٹھیک ہو جائے گا۔ صحت مند و تندرست۔"،روحان کامل کی پشت سہلا کر نم آنکھوں سے مسکراتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

میرال کامل پر ہی نظریں جمائے ہوئے تھی۔ تھوڑی دیر میں رضا اور ایمان بھی آ گئے تھے۔ خوب رونق جمی تھی۔ مگر میرال کو سب کچھ پس منظر میں جاتا محسوس ہو رہا تھا۔ اب ایمان ہولے سے کچھ گنگنا رہی تھی۔

"بیماری نے چُپکے سے چھینا خواب ہمارا

ہر دعا میں مانگا تھا، تیرا سایہ دوبارہ

میرے ہاتھوں کی لکیروں میں بس تیرا نام تھا

پر نصیب نے جیسے سب مٹا دیا"

الفاظ انجانے میں ادا ہوتے دو نفوس کے دل میں گڑھتے جا رہے تھے۔ رات کا اندھیرا کافی حد تک پھیل چکا تھا۔ وہ اب بھی دھیرے دھیرے گنگنا رہی تھی۔

"میری دنیا سنّاٹے میں ڈوبی رہتی ہے

تیری یاد ہی اب میرا سہارا رہتی ہے

اگر موت بھی آئے، تو تیرے پاس لے جائے

تا کہ ہم دوبارہ مل سکیں، کسی اور جہاں میں")

یوں جیسے ہوا یکایک تھم گئی ہو، وہ خاموش ہوئی تو ایمان بس محوِ حیرت اسے تکتی رہ گئی۔ اُس لمحے ایمان کے دل پر جیسے مہر ثبت ہو گئی تھی کہ محبت صرف اُس کے اور ارتضیٰ کے ساتھ نہیں، بلکہ اپنے ہر اسیر کے ساتھ یکساں سخت گیر رہتی ہے۔ محبت جابر و سفاک فطرت کی مالک ہے اور اس کے اسیر اس کے ابدی قیدی۔

اسے آج بھی وہ ایام یاد تھے جب وہ میرال کی خاموشی کو اس کی دوری سمجھنے لگی تھی۔ جب وہ اس کی آنکھوں کی ویرانی کو سرد مہری سمجھنے لگی تھی۔ مگر آج سمجھ آیا تھا، کہ کیا ہوا تھا آخر اس ایک شام جس نے میرال کو خاموش کر دیا تھا۔ وہ غرور یا کھچاؤ نہیں تھا، وہ تو اذیت تھی۔ وہ تکلیف تھی جو نجانے کتنے ہی عرصے اس نے اکیلے جھیلی تھی۔ وہ واقعتاً کامل اور اس کے لیے خوش تھی۔ بہت زیادہ خوش۔ اتنی تکالیف کے بعد اس ساتھ کے وہ دونوں ہی حقدار تھے۔

***

دن پنکھ لگا کر اڑے تھے۔ بیچ سے ایک مہینہ تو یوں گزرا تھا جیسے ہر شے کسی فاسٹ فارورڈ فلم کی مانند ہو۔ خزاں ختم ہونے کو تھی۔ سردیاں شروع ہونے کو تھیں۔ دن کے وقت شدید گرمی ہوتی تو رات کے پہر اچھی خاصی ٹھنڈ۔ ایسے میں کینیڈا کی بات کریں تو یہاں تو سردیاں اپنے جوبن پر تھیں۔ ایک دو بار تو برف باری بھی ہو چکی تھی جس کی باعث موسم کافی سرد ہو چکا تھا۔

ایسے میں ہسپتال کی سرد سی راہداری میں اس وقت موت کا سناٹا چھایا ہوا تھا۔ او ٹی کے باہر لگی نشستوں میں سے ایک پر حسنہ سر جھکائے بیٹھی تھی جبکہ اس سے کچھ فاصلے پر کامل سر اٹھائے منتظر سا او ٹی کی سرخ بتی کو دیکھ رہا تھا۔ اس کی شیو بڑھی ہوئی تھی جبکہ آنکھیں سرخ پڑ کر رت جگے کی چغلی کھاتی تھیں۔

جبھی اس نے چہرہ موڑ کر حسنہ کو دیکھا تھا۔ اسے داہنے جانب سے نظر آیا تھا کہ وہ رو رہی تھی۔ اس کے رخسار اس ٹھنڈ میں بھی آنسوؤں سے تر تھے۔ وہ سیدھا ہو بیٹھا تھا۔

"حسنہ۔۔۔ کیا ہو گیا ہے یار؟"، اس نے ہلکے پھلکے سے انداز میں پوچھا تھا۔ حسنہ نے چہرہ اٹھا کر اسے دیکھا تو سرخ پڑتی ناک بھی نظروں کے سامنے آئی۔ اس کا حلیہ بھی ملگجہ سا ہو رہا تھا۔ کل والے کپڑوں پر بھورا اونی جیکٹ پہنے، سر اور شانوں پر دوپٹہ اوڑھے، وہ دوپٹے کی اوٹ سے رخسار پر گرتی آوارہ لٹوں سے بالکل بے نیاز لگتی تھی۔

"اتنی دیر ہو گئی ہے، کامل بھائی۔ ڈاکٹرز ابھی تک باہر نہیں آئے۔ میرا دل بہت گھبرا رہا ہے۔ کہیں کوئی کامپلیکیشن تو نہیں ہو رہی آپریشن میں؟ میں پوچھ کر آتی ہوں۔"، وہ کہتے ہوئے یکدم ہی اٹھ کر مڑی تھی اور اسی پہر اوٹی کی بتیاں سبز ہوئی تھیں۔ ابھی کامل بھی اسے روکنے کو اٹھ کھڑا ہوا ہی تھا کہ سبز ہوتی بتی دیکھتے ہی آگے بڑھ آیا۔ حسنہ کی ٹانگیں ایک بار پھر ملنے سے قاصر ہو گئی تھیں۔۔۔ بالکل ویسے ہی، جیسے روحان کے ایکسیڈنٹ کے وقت ہوئی تھیں۔ ٹانگوں میں سے ساری جان جیسے کچھ پلوں کے لیے سلب کر لی گئی تھی۔ وہ سانس روکے سامنے دیکھ رہی تھی جہاں اب اوٹی کے دروازے جدا ہو رہے تھے۔ ڈاکٹرز ہاتھوں سے دستانے اتارتے ہوئے ان کی جانب ہی بڑھ آئے تھے۔ کامل آگے ہی تھا۔

"آج کی سرجری کامیاب رہی ہے۔ کانگریچولیشنز۔۔۔ اب بس ان کے ہوش میں آنے کا انتظار ہے۔ ابھی وہ اینستھیزیا کے زیرِ اثر ہیں۔ جیسے ہی ہوش میں آتے ہیں، آپ ان سے مل سکتے ہیں۔"، پہلا ڈاکٹر نہایت پیشہ ورانہ انداز میں کہتا، کامل کا شانہ تھپکتا آگے بڑھ گیا تھا۔۔۔

اور پھر یکدم ہی ساکت کھڑی حسنہ کے سامنے آیا تو رکا۔ وہ شاکڈ سی ٹکٹکی باندھے انہیں ہی دیکھ رہی تھی۔ آنکھوں سے بہتے آنسو تک رک گئے تھے۔ ڈاکٹر اسے دیکھ کر نہایت دھیمے سے انداز میں مسکرا کر آگے بڑھ گیا تھا۔

حسنہ کی ٹانگوں میں سے رہی سہی جان بھی جیسے نکل چکی تھی۔ وہ ڈھے جانے کے سے انداز میں زمین پر بیٹھتی چلی گئی تھی۔

کیا وہ ڈاکٹر کے الفاظ تھے یا کوئی نوید؟

کیا وہ اس کی زندگی کی نوید نہ تھے؟

دوسرا ڈاکٹر اب کامل کو مزید باریکیاں بتا رہا تھا۔ مگر وہ کچھ نہیں سن رہی تھی۔ آج کا آپریشن میجر تھا۔ آج کی کامیابی کا مطلب تھا کہ اب روحان بالکل صحیح ہو چکا ہے۔ بس اب ایک مائینر سرجری ہونی تھی۔۔۔ وہ کس طرح اللہ کا شکر ادا کرتی، اسے سمجھ نہیں آرہا تھا۔ اور شکر گزاری کی معراج تو سجدہ ہوا کرتی ہے ناں! وہ اگلے ہی پل سجدے میں گر گئی تھی۔ اسکے پاس کہنے کو

www.novelsclubb.com

شکر گزاری کے الفاظ نہیں تھے۔ اس کے پاس پیش کرنے کو شکر گزاری کے آنسو تھے۔ اور پھر شکر گزاری کے لیے آنسوؤں سے بہتر کیا ہے؟

دور کہیں سے اب کسی اسٹریچر کو گھسیٹنے کی مدھم چرچراتی آواز سماعتوں میں پڑ رہی تھی۔ وہ سر جھکائے اس سرد سی راہداری میں اپنے شکر گزاری کے آنسوؤں کی گرمائش محسوس کر رہی تھی۔ اور پھر کبھی کبھی زندگی میں یونہی بہت کچھ صحیح ہونے لگتا ہے۔ ہماری نظروں کے سامنے۔ اور پھر ہم یوں ہی بے یقینی اور شکر گزاری کے بیچ کھڑے رہ جاتے ہیں۔

٭٭٭

www.novelsclubb.com

کامل کی ایک ہفتے بعد کی فلائٹ تھی۔ اس کے پاکستان جانے کے دو دن بعد اس کا اور میرال کا نکاح طے پایا تھا۔ اس وقت وہ ہسپتال سے بہت زیادہ تھکا ہارا گھر لوٹا تھا۔ سیدھا اپنے کمرے میں جا کر سب سے پہلے وہ فریش ہوا تھا اور پھر طمانیت سے چلتا ہوا لاؤنج میں چلا آیا تھا

جہاں حائمہ بیٹھی ٹی وی پر کوئی شو دیکھ رہی تھیں۔ اسے لاؤنج میں آتا دیکھ کر دھیما سا مسکرائیں۔

"کیا حال ہے میرے بیٹے کا؟"

"ٹھیک ٹھاک، الحمدللہ۔"، چہکتے انداز میں کہتا وہ ان کے برابر میں ہی صوفے پر بیٹھ گیا تھا۔ اب وہ ان کے ہاتھ میں تھامے باؤل سے ہاتھ لمبا کیے چپس اچک کر منہ میں ڈالتا جا رہا تھا۔ حائمہ نے سر جھٹکا تھا۔

"روحان کیسا ہے؟"، اس نے چپس کھاتے ہوئے ہی سر اثبات میں ہلایا تھا۔

www.novelsclubb.com

"بہت بہتر، اللہ کا شکر۔"

"اور حسنہ؟"، انہوں نے فکرمندی سے پوچھا تھا۔

"وہ بھی ٹھیک ہے ماشاءاللہ۔۔۔ مگر۔۔۔"، اور وہ بولتے بولتے یکدم ہی چپ ہوا تھا۔ حائمہ نے اس کے 'مگر' پر چہرہ موڑ کر اسے دیکھا تھا۔ ان کی آنکھوں میں سوال سا تھا۔

"مگر ایمان صحیح نہیں ہے، امی۔"، بولتے ہوئے اس نے یکدم ہی ان کے ہاتھ سے باؤل پکڑ کر سینٹر میز پر رکھا تھا اور پھر ان کی گود میں سر رکھ کر لیٹ گیا تھا۔

"کیا ہوا ایمان کو؟"، وہ تفکر سے بولی تھیں۔

"اس نے اپنا گھر چھوڑ دیا ہے، امی۔ اور اب وہ اکیلی کراچی میں رہ رہی ہے۔۔۔ اکیلے رہنا کتنا مشکل ہوتا ہے ناں امی۔۔۔ وہ کیسے رہ رہی ہوگی؟"، اس کے لہجے میں اداسی گھلی تھی۔ آنکھیں ہلکی سی نم تھیں۔ حائمہ نے کچھ حیرت سے اسے دیکھا تھا۔

"گھر چھوڑ دیا؟ گھر کیوں چھوڑ دیا؟"، ان کے لہجے میں بے یقینی تھی۔

"رضیہ آنٹی نے بھیجا ہے اسے کراچی۔ انکل اس کی کسی پکی عمر کے آدمی سے زبردستی شادی کروا رہے تھے۔"، اس کے بتانے پر حائمہ کا ہاتھ بے ساختہ ان کے دل کے مقام پر جا پڑا تھا۔

"یا اللہ۔۔۔ اب کیا ہوگا؟"، کامل نے لاعلمی کے عالم میں سر نفی میں ہلایا تھا۔

"رابطہ ہے کسی کا اس سے؟"

"میں نے تو بہت بار ٹرائی کیا نمبر۔۔۔مگر کال پک نہیں کر رہی وہ۔۔۔روحان یا حسنہ کا بھی نہیں ہے۔۔۔مگر۔۔۔"،اور وہ یکدم ہی اتنی تیزی سے اٹھ بیٹھا تھا کہ حائمہ نے ڈر کر اس کے شانے پہ چپت لگائی تھی۔

"مگر کیا پتا کہ رضا کا ہو۔۔۔اوہ یس!"،اور وہ اٹھ کر دوڑتا ہوا اپنے کمرے کی جانب بھاگا تھا۔ حائمہ سر نفی میں ہلاتی رہ گئی تھیں۔ان کی سمجھ سے باہر تھی ان کی یہ اولاد۔

وہ اضطرابی کیفیت میں کمرے میں ٹہلتا، فون کان سے لگائے ہوئے تھا۔چہرہ پر بے چینی کے آثار صاف دکھائی دیتے تھے۔ایک ہاتھ بالوں میں پھیرتے وہ نجانے کیوں اتنا جلد باز ہو رہا تھا۔ جبھی اگلی جانب سے کال اٹھالی گئی تھی۔

"ہیلو۔"،رضا کی مری مری سی آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی تھی۔وہ یکدم ہی ٹہلتے ٹہلتے رک گیا تھا۔

"ہیلو رضا۔ میں کامل۔"،اسے لگا کہ شاید وہ نیند سے اٹھا ہے جبھی اتنی تھکی تھکی سی آواز میں بات کر رہا تھا۔

"ہاں بولو، کامل۔"،وہ اسی انداز میں بولا تو یکدم ہی کامل ٹھہرا۔ پھر اس کی آنکھوں میں تشویش سی ابھری۔

"تم ٹھیک ہو، رضا؟"،اس نے نجانے کس احساس کے تحت پوچھا تھا۔ اگلی جانب چند پلوں تک خاموشی چھائی رہی تھی۔

"ہوں۔۔۔ ٹھیک ہوں۔ تم کیسے ہو؟"،کچھ دیر بعد وہ بولا تو آواز اور لہجہ تھوڑا سنبھلا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ کامل کے دل کو کچھ ہوا تھا۔

"میں بھی ٹھیک ہوں۔۔۔ بس ایک بات پوچھنی تھی تم سے۔۔۔ مگر کل پوچھ لوں گا۔ ابھی تم مجھے تھکے ہوئے لگ رہے ہو۔"،وہ بولا تو اگلی جانب رضا نے آنکھیں موند کر سر بیڈ کراؤن سے

ٹکایا تھا۔ وہ واقعی تھکا ہوا تھا۔ آنکھوں کے گرد گہرے سیاہ حلقے، شہد رنگ نینوں کی چمک ماند سی پڑ چکی تھی۔ ایک تھکاوٹ سی اس کے چہرے کا چوبیس گھنٹے احاطہ کیے رکھنے لگی تھی۔

چند ایک مزید باتیں کر کے کامل نے کال کاٹ دی تھی۔ رضا نے بے رونق آنکھیں اٹھا کر سامنے دیکھا تھا۔ اس کے عین مقابل کھڑی دیوار پر ایک تصویر مقناطیس کے ذریعے چسپاں کی گئی تھی۔

وہ پانچ سا تھی۔۔۔

پانچ ہمراہی۔۔۔

www.novelsclubb.com

وہ پانچوں الگ الگ تھے مگر پھر بھی ایک سے تھے۔ زندگی کے ظلم وستم کے شکار۔۔۔

وقت کی ناانصافیوں کے شاہد۔۔۔

مگر جو شے ارتضیٰ مراد کو ان سے جدا کرتی تھی، وہ اس کی ظاہری اور باطنی تنہائی تھی۔ باقی چاروں مُشکلات میں تھے مگر ان کے پاس کوئی تو تھا جو ان کو سنتا، ان کو سمجھتا، زیادہ نہیں تو ان سے چند نرم الفاظ بولتا۔۔۔

مگر ارتضیٰ مراد تنہا تھا۔ پردیس میں تن تنہا رہنا اذیت ناک تھا۔۔۔ شاید موت کے مترادف!

زندگی اسے ایک ایسے موڑ پر لے آئی تھی جہاں باری باری وہ اپنے تمام رشتوں سے الگ ہو کر رہ گیا تھا۔۔۔ اور زندگی کا یہ موڑ اسے کاٹ کھانے کو دوڑتا تھا۔ تکلیف سے دوچار کرتا تھا۔۔۔ مگر وہ مجبور تھا۔ اسے یہ سب سہنا ہی تھا۔ یہ جہنم اس نے خود چنی تھی اپنے لیے!

اور غلطیوں کے خمیازے تو بھگتنے پڑتے ہیں ناں!

وہ بھی اپنی چنی جہنم میں پل پل جل رہا تھا، تڑپ رہا تھا!

مگر پھر جل کر ہی تو سونا کندن بنتا ہے ناں! کندن بننے کے لیے جلنا تو پڑتا ہی ہے۔

***

اسٹیج پر پوڈیم کے پیچھے کھڑے پروفیسر سر اٹھائے تمام طالب علموں کو دیکھتے لیکچر دے رہے تھے۔ انہیں یونیورسٹی آتے آج دوسرا ہفتہ ختم ہونے کو تھا۔ طالب علموں کے جھرمٹ میں ایمان بھی بیٹھی نظر آرہی تھی۔ سیاہ رنگ کے سادہ سے شلوار قمیض کے ساتھ ہم رنگ دوپٹہ پہنے وہ چہرہ اٹھائے انہماک سے پروفیسر کو سن رہی تھی جواب آخری کے چند نقطے گنوا رہے تھے۔

لیکچر ختم ہوا تو پروفیسر کے جاتے ہی طلباء کا رش چھٹنے لگا۔ سب تیزی سے کمرۂ جماعت سے نکلتے باہر جا رہے تھے۔ ایمان سر جھکائے اپنا رجسٹر اور قلم بستے میں ڈال رہی تھی کہ یوں ہی اس کی نگاہ اٹھی۔ اور پھر آنکھوں میں خوشگواری سی اتری۔

سامنے سے ہانا چلتی ہوئی آرہی تھی۔ فیروزی رنگ کی کرتی کے ساتھ پلازو پہنے، بالوں کو ہم رنگ اسٹالر سے ڈھکے، وہ بستہ کاندھے پر لٹکائے، بستے کی اسٹریپ تھامے اسے دیکھتی وہیں چلی آرہی تھی۔ ایمان مسکراتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

novelsclubb@gmail
www.novelsclubb.com
IG: @novelsclubb

"خیریت ہے جی؟یہاں کیسے؟"،وہ مسکراتے ہوئے بولی تو ہانا نے بیگ کی اسٹریپ چھوڑ کر کاندھے اچکائے۔

"کینٹین جا رہی تھی۔ تمہاری کلاس سے اسٹوڈنٹس کو نکلتے دیکھا تو تمہیں لینے چلی آئی۔ بولو چلو گی؟"

"بالکل چلوں گی۔"،وہ بولتے ہوئے کرسی کے پیچھے سے باہر نکل آئی تھی۔ پھر مڑ کر اپنا بیگ اٹھا کر کاندھوں پر ڈالا اور ہانا کے ساتھ ہی باہر چلی آئی۔ ان کے قدموں کے رخ اب کینٹین کی جانب تھا۔

"سنا ہے کہ کل تمہیں کسی پروفیسر سے ڈانٹ پڑی ہے۔"،ہانا نے چلتے ہوئے لب دبا کر مسکراہٹ روکتے ہوئے کہا تو ایمان نے ایک خفگی بھری نگاہ اس پر ڈالی جو اس کے دیکھنے پر اب چہرہ پھیر کر لب دبائے ہوئے تھی۔

"تمہیں کیسے پتا چلا؟"،ایمان نے سر جھٹکتے ہوئے پوچھا تو ہانا نے سر اس کی جانب پھیرا۔

"سب پتا ہوتا ہے مجھے۔"،شانے جھٹک کر ایک ادا سے کہا تو ایمان کے لبوں کو بے ساختہ ہی ایک مسکراہٹ نے چھولیا۔

"میں نے اسائنمنٹ نہیں جمع کروایا تھا۔ بلکہ یہ کہنا بہتر ہو گا کہ اسائنمنٹ میں نے جمع کروایا تھا،ان کے پاس نہیں پہنچا تھا۔"،وہ چڑ کر بولی تو ہانا نے ناسمجھی سے اسے دیکھا۔

"یہ تو پھر ایک بہانہ ہوا۔ تم نے واقعی کروایا تھا یا ان کے سامنے یہ بہانہ کیا؟"،اس نے نظریں سکیڑ کر اسے دیکھتے ہوئے پوچھا تو ایمان نے لب دانتوں تلے دبائے۔ پھر اس کی جانب جیسے ہی دیکھا تو ہنسی روکنے کی تمام کوششیں دم توڑ گئیں اور وہ بے ساختہ ہلکا سا قہقہہ لگا کر ہنس پڑی۔ ہانا نے افسوس سے سر نفی میں ہلایا تھا۔

"چچ چچ چچ۔ بہت بری بات ہے۔ اور اوپر سے منہ ایسے پھلا رہی ہو جیسے سر نے تمہارے ساتھ ناانصافی کی ہو۔"،ہانا کے بولنے پر وہ ایک بار پھر مسکرائی تھی۔

www.novelsclubb.com

"چلو مان لیا کہ غلطی میری ہے مگر پھر بھی سب کے سامنے تو یوں باتیں نہیں سنانی چاہیئں ناں۔یہ تو غلط بات ہے۔ہم انسان ہیں اور غلطیاں تو انسانوں سے ہی ہوتی ہیں ناں!"،وہ سر افسوس سے جھکائے کہتی جا رہی تھی۔ہانا نے اسے دیکھتے سر نفی میں ہلایا تھا۔

"یعنی اپنی غلطی نہیں مانو گی؟"،ایمان نے اسے دیکھ کر ہلکا سا مسکرا کر سر نفی میں ہلایا تھا۔

"نہیں!"

"چڑیل۔۔۔"،اس کے شانے پہ چپت لگاتے ہانا نے کہا تو ایمان ہنس پڑی۔ہانا خود بھی ہنس پڑی تھی۔دونوں صحیح ٹکرائی تھیں ایک دوسرے سے۔ایک سے بڑھ کر ایک!

www.novelsclubb.com

کچھ دیر بعد وہ دونوں کیفٹ ایریا میں ایک دوسرے کے مقابل بیٹھی لنچ کر رہی تھیں۔ساتھ ہلکی پھلکی گپ شپ بھی کی جا رہی تھی۔جبھی ایک پل کو ایمان نے ٹھہر کر اسے دیکھا تھا۔

"اگر میں تمہیں کچھ بتاؤں۔۔۔تو تم جج تو نہیں کرو گی؟"،ایمان نے محتاط سے انداز میں کہا تو ہانا نے اسے اسی انداز میں دیکھتے سر نفی میں ہلایا تھا۔

"بالکل بھی نہیں!"۔ لنچ کرنے کے بعد اب وہ ہاتھ جھاڑتی پوری طرح سے اس کی جانب متوجہ ہوئی تھی۔ ٹھوڑی تلے ہتھیلی ٹکائے وہ اسے منتظر سی دیکھ رہی تھی۔ ایمان نے گلا کھنکار کر اسے دیکھا تھا۔

"میں حیدرآباد سے ہوں۔"وہ ٹھہری تو ہانا نے اس کا حوصلہ بڑھانے کو سمجھ کر سر ہلایا۔ "میں نے پچھلے سال انٹر مکمل کیا تھا۔۔۔اور پھر میرے ابا میری شادی کروانے لگے۔ کافی رشتے دیکھے مگر آخر میں کہیں بات نہ بنی تو ان کے ان ایک دوست کے بیٹے تھے جو عمر میں مجھ سے پندرہ سال بڑے تھے۔ ابا نے ان سے میرا رشتہ طے کر کے منگنی کر دی۔ نہ مجھ سے پوچھا نہ کچھ۔ بس حکم صادر کیا۔"

وہ ذرا ٹھہر کر ہانا کے چہرے پر کچھ تلاشنے لگی تھی۔ مگر وہاں کچھ نہیں تھا۔ صرف ایک کنسرن! ایک فکر!

www.novelsclubb.com

"تقریباً پانچ ماہ پہلے میرا نکاح تھا اس آدمی سے۔۔۔اور میں بھاگ گئی گھر سے۔"،اب کے اس نے کہہ کر ہانا کا چہرہ دیکھا تھا۔اس کے چہرے پر کوئی ہتک کیوں اور کیسے نہیں تھی؟

"کیا کوئی اور راستہ نہیں تھا؟"،اب کے ہانا نے پوچھا تو ایمان نے سر نفی میں ہلا دیا۔

"نہیں!اور کوئی راستہ نہیں تھا۔میری اماں نے مجھے رات کے اندھیرے میں بھگا دیا گھر سے اور یہاں کراچی بھیج دیا۔اماں کا یہاں ایک گھر تھا،اسی لیے وہ مطمئن تھیں۔۔۔مگر یہاں پہنچ کر علم ہوا کہ میرے بھائی وہ گھر بھی بیچ چکے ہیں۔وہ رات بہت سیاہ رات تھی۔اس روز بہت بارش بھی ہوئی تھی۔"،اس نے ذرا ٹھہر کر پھر بولنا شروع کیا تھا۔ہانا بس ایک منفرد سی نرمی چہرے پر سجائے اسے سنتی جا رہی تھی۔"اس رات۔۔۔اس رات میں کسی کی درندگی کا شکار بننے والی تھی جب مجھے غزل ملی تھیں۔انہوں نے مجھے بچایا تھا۔اور اب میں ان کے ساتھ رہ رہی ہوں۔"

وہ بول کر خاموش ہوئی تو ہانا نے اب کے سمجھ کر سر ہلایا۔ وہ اسے جج نہیں کر رہی تھی۔ وہ اسے جج کیسے نہیں کر رہی تھی؟

"اب ٹھیک ہو تم؟ جن کے ساتھ تم رہ رہی ہو، وہ کیسی ہیں؟ بھروسے کے قابل ہیں؟"، اس نے پوچھا بھی تو بس یہ! ایمان نے سر اثبات میں ہلایا تھا۔

"ہاں! وہ غزل رمیص ہیں۔ رمیص جہانزیب شہید کی بیوہ۔"، اور یہاں اس نے ہانا کی آنکھوں کو باقاعدہ پھیلتے ہوئے دیکھا تھا۔ بے یقینی کے مارے اس کا منہ کھل گیا تھا۔

"نہ کرو۔ سچ میں؟"، وہ جتنا بے یقین ہوتی، اتنا کم تھا۔ ایمان نے سر اثبات میں ہلایا تھا۔ ہانا تیزی سے آگے ہوئی تھی۔

"مجھے یقین نہیں آرہا۔"، اس کے کہنے پر ایمان کھلکھلادی تھی۔ پھر شانے جھٹک کر پیچھے ہوتے ہوئے بولی۔

"ناول لکھی جا سکتی ہے ناں اس کہانی پر؟"، اس کے مزاق میں کہنے پر ہانا نے تیزی سے سر اثبات میں ہلایا تھا۔

"مجھے یقین ہے ایسی سینکڑوں ہزاروں باتیں اور ہوں گی جو ابھی مجھے نہیں پتا۔ تم ناول لکھ سکتی ہو۔ یہ واقعی اچھا آئیڈیا ہے۔"، اس کے جوش سے کہنے پر ایمان کے دماغ میں کچھ کلک ہوا تھا۔ اگر وہ افسانے لکھ سکتی تھی تو ناول بھی لکھی جا سکتی تھی۔ سوچ کر وہ خود ہی مسکرا دی تھی۔ کتنی بیوقوفانہ سوچ تھی یہ!

ہانا اب بھی سر اثبات میں ہلا رہی تھی۔

"مزاق نہیں کر رہی میں۔ سوچنا اس بارے میں ضرور۔"، وہ بولی تو ایمان نے سر نفی میں ہلا دیا۔ کیا ہو گیا تھا؟ وہ ناول کیسے لکھ سکتی تھی؟ ایسا تو بالکل ممکن نہیں تھا!

***

رات کے دس بج رہے تھے۔ ایمان اس وقت غزل کے ساتھ اس کے کمرے میں بیٹھی تھی۔ سبز رنگ کے ہلکے پھلکے سے قمیض شلوار زیب تن کیے، وہ رف سا جوڑ ھا بنائے ہوئی تھی۔ گلے میں ہم رنگ دوپٹہ ڈال رکھا تھا۔ اس کے سامنے ہی غزل بیٹھی ہوئی تھی۔ وہ سادہ سے لباس میں ملبوس تھی۔ دوپٹہ ساتھ ہی پلنگ پر پڑا تھا۔ بال گول مول کر کر ڈھیلے سے جوڑے میں مقید کر رکھے تھے۔

بستر پر ہاتھ پیر مارتی ادھر ادھر جھکی وہ ہلکا ہلکا مسکراتی اس سے چھوٹی چھوٹی باتیں کرنے میں مصروف تھی۔ ایمان ٹھوڑی تلے ہتھیلی جمائے اسے پر شوق انداز میں دیکھ رہی تھی۔ کل غزل کی زندگی کا ایک بہت بڑا دن تھا۔ کل گویا فیصلے کا دن تھا۔ کل وہ پہلی بار کورٹ میں پیش ہونے والی تھی۔۔۔ اس کا دل پریشان و مضطرب سا تھا۔ چہرے پر بکھری مسکراہٹ میں کہیں کہیں دبی ہوئی بے چینی نظر آتی تھی۔ ایمان اسے چند پل دیکھتے رہنے کے بعد کچھ سیدھی ہوئی تھی۔

"ایک بات تو بتائیں،غزل۔"،وہ بولی تو غزل نے یونہی سر اٹھا کر سوالیہ نگاہوں سے اسے دیکھا۔

"کیا آپ شروع سے ہی ایسی کم گو،ریزروسی تھیں؟مطلب آپ کی نیچر شروع سے ایسی ہی ہے؟"،اس کے پوچھنے پر غزل ہلکا سا مسکرائی تھی۔ پھر ارحہ کو گود میں لیتی سر نفی میں ہلانے لگی تھی۔

"میں لاابالی اور پٹر پٹر کرنے والی تو کبھی نہیں تھی،ہاں مگر اتنی خاموش اور کم گو بھی نہیں تھی۔ میں ایمبیورٹ تھی۔ صرف ان کے ساتھ بولتی تھی جن کے ساتھ کمفرٹیبل ہوتی تھی۔جہاں تک بات رہی ریزرو رہنے کی تو گریجویشن کے بعد میں نے جب پردہ شروع کیا تو آہستہ آہستہ خود ہی دنیا سے کنارہ کش ہونا شروع کر دیا۔باقی فطرت تو میری ایسی ہی تھی شروع سے۔"،وہ بول کر خاموش ہوئی تو ایمان کے دل میں ایک بات سی ابھری۔ایک خیال سا!

"چہرے کا پردہ تو فرض نہیں ہے۔ تو پھر آپ کیوں کرتی ہیں؟ مطلب صرف حجاب سے بھی کام چل جاتا۔۔۔ یا اگر کر بھی رہی تھیں تو اتنا سخت کیوں کہ گھر والوں سے بھی؟"،اس نے پوچھا تو اب کے غزل ہلکا سا مسکرائی۔

"یہ بہت لمبی گفتگو ہے۔ سننا چاہتی ہو؟"،ذرا سی آنکھیں سکیڑ کر اس نے پوچھا تو ایمان کا سر بے اختیار ہی اثبات میں ہلا۔

"سب سے پہلی بات کا جواب دیتی ہوں پہلے کہ چہرے کا پردہ تو فرض نہیں۔۔۔ تو جواب یہ ہے کہ ایسا کہاں لکھا ہے کہ چہرے کا پردہ فرض نہیں؟"،ایمان ذرا کنفیوژن کا شکار ہوئی۔ نا سمجھی سے اسے دیکھا۔ پھر دھیرے سے بولی۔

"تو ایسا کہاں لکھا ہے کہ چہرے کا پردہ فرض ہے؟"

"اے نبی! اپنی بیویوں سے اور اپنی صاحبزادیوں سے اور مسلمانوں کی عورتوں سے کہہ دو کہ وہ اپنے اوپر اپنی چادریں لٹکالیا کریں۔ اس سے بہت جلد ان کی شناخت ہو جایا کرے گی پھر نہ ستائی جائیں گی اور اللہ تعالیٰ بخشنے والا مہربان ہے۔"

"اپنے اوپر چادر لٹکانے سے کیا مراد ہوئی، ایمان؟ کہ اپنے جسم کو ڈھکو، کور کرو۔ ذرا اور سمجھانے کے لیے ایک بات بتاتی ہوں۔۔۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں ہر حکم کی تعمیل کرنا سکھائی۔ قرآن کی ہر بات پر عمل کرنا سکھایا۔۔۔ جب پردے کا حکم نازل ہوا تو ہماری ازواج مطہرات، بیبیوں اور صحابیات نے کیسا پردہ کیا، وہ ہمارے لیے وہ عملی طریقہ تھا جو اللہ کے رسول نے ہمیں سکھایا۔ پھر کچھ لوگ یہ کہتے ہیں کہ وہ تو بیبیاں تھیں، ان کا پردہ سخت تھا۔۔۔ تو اس آیت میں صاف لکھا ہے کہ مسلمانوں کی عورتوں سے کہہ دو۔۔۔ ہم مسلمانوں کی عورتیں ہی ہیں ناں؟؟؟"

ایمان کو جیسے سانپ سونگھ گیا تھا۔ وہ کچھ بھی بولنے کے قابل نہیں رہی تھی۔ غزل اب مزید کہہ رہی تھی۔

"ہم سے نہیں ہو پاتا پردہ۔ مشکل ہے۔ مگر اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ہم آیتوں اور ان کے مفہوم میں ردوبدل کر کے انہیں اپنی مرضی سے ڈھال لیں۔ جو اللہ نے کہا، وہ فرض ہے۔ ہمارے نہ کرنے سے وہ فرض بدل تو نہیں جاتا۔ قصور ہمارا ہوتا ہے کیونکہ فرض تو سب کے لیے یکساں ہوتا ہے ناں!"، ایمان کا سر بے اختیار اثبات میں ہلا تھا۔

"پھر آتے ہیں تمہاری اگلی بات کی طرف کہ گھر والوں سے پردہ کیوں؟ ہمارا گھر وہ ہوتا ہے جو ہمارا کنبہ ہو۔ ہمارے لیے ہمارے باپ، بھائی، شوہر، بیٹوں، بھانجوں، بھتیجوں کو محرم بنایا گیا۔ ہمارا گھر وہی ہیں۔ ان کے علاوہ کوئی مرد ہمارے گھر کا نہیں ہوتا۔۔۔ یہ تو پاکستان، انڈیا وغیرہ جیسے ملکوں میں ہوتا ہے کہ سارا خاندان ایک گھر میں رہائش پذیر ہوتا ہے۔ وہ ہمارے رشتے دار تو ہو سکتے ہیں مگر ہمارے محرم نہیں۔۔۔ اسی لیے پردہ تو غیر محرم سے کرنا فرض

ہے۔ جو محرم نہیں، وہ گھر والا بھی نہیں۔ "وہ کہہ کر خاموش ہوئی تو کمرے میں ایک خاموشی سی چھا گئی۔

ایمان لب کترتی اپنی انگلیاں مروڑ رہی تھی۔ کچھ دیر میں ارحہ ذرا نیند میں چلی گئی تو غزل نے اسے بستر پر تکیوں کے درمیان لٹا دیا۔

"آپ ٹھیک ہیں، غزل؟"، اس نے یکدم ہی پوچھا تو غزل کی آنکھوں میں نمی جھلملائی۔ ایک نم سانس خارج کر کے اس نے سر دھیرے سے نفی میں ہلایا تھا۔

"میں ٹھیک نہیں ہوں، ایمان۔ "وہ سر جھکا گئی تھی۔ آنسو نجانے کہاں سے اب لڑیوں کی صورت ٹپ ٹپ رخساروں سے لڑھکنے لگے تھے۔ اتنی دیر سے جمع ہوئی جس گھٹن بھری کثافت نے اس کو جکڑ رکھا تھا، اب وہ گرم آنسوؤں کی صورت باہر آ رہی تھی۔

"میں مضبوط بنتے بنتے تھک گئی ہوں، ایمان۔ میں رمیص نہیں ہوں۔ میں غزل ہوں۔

رمیص مضبوط تھا، بہادر تھا۔ غزل نہ مضبوط ہے نہ بہادر۔ میں ان ظالموں سے نہیں ڈرتی۔ میں

www.novelsclubb.com

بس جذباتی طور پر کمزور پڑ گئی ہوں۔۔۔"وہ بولتی جا رہی تھی اور آنسو بہتے جا رہے تھے۔اس کی آواز میں ہلکی سی لرزش محسوس ہوتی تھی۔"میری ہمت بڑھانے والا کوئی نہیں ہے۔کوئی ایسا نہیں جو رمیص کی طرح میری ہمت بندھا سکے۔حقیقت تو یہ ہے کہ میں رمیص کے سہارے کی عادی ہو گئی ہوں،ایمان۔اس کی غیر موجودگی مجھ سے میری تمام ہمت چھین رہی ہے۔۔۔ کیوں چلے جاتے ہیں ایسے ہماری زندگی کے سب سے اہم لوگ؟ کیوں؟"

(ایمان کو یکدم ہی وہ شہد رنگ آنکھیں یاد آئی تھیں۔۔۔جو جاتے جاتے اسے وداع کر رہی تھیں۔جو نم تھیں،بالکل اس کی آنکھوں کی طرح۔جو محبت جھلکاتی تھیں۔عقیدت دکھلاتی تھیں۔

پھر اسے آدم یاد آیا تھا۔وہ آخری لمحہ یاد آیا تھا جب وہ رات کے اندھیرے میں کاندھے سے بستہ لٹکائے،دروازے پر کھڑا رضیہ کے گلے لگ رہا تھا۔وہ جھک کر ان کا ماتھا چوم رہا تھا۔ ایمان کمرے کی کھڑکی سے اسے دیکھ رہی تھی۔اسے ایک آخری مرتبہ اس کے گلے لگ کر

رونا تھا۔ مگر وہ نہیں جا سکتی تھی۔ وہ راز تھا جو اس رات اس نے دیکھا تھا۔ اور وہ راز آدم کے ساتھ ہی ان کی زندگیوں سے گویا چلا گیا تھا۔

پھر اسے میرال سے وہ آخری بار گلے ملنا یاد آیا تھا۔ اسے یاد تھا کہ وہ میرال سے ناراض تھی۔ میرال حد درجہ خاموش تھی۔ اور ایمان کو اس کی یہ خاموشی نہیں پسند آ رہی تھی۔

اسے یاد تھا کہ کامل کینیڈا جاتے وقت اس سے مل کر نہیں گیا تھا۔ وہ لوگ رات کے اندھیرے میں سامان باندھ کر ایئر پورٹ کے لیے نکل گئے تھے۔ قصور انکا نہیں تھا۔ کامل کی حالت ہی ایسی تھی کہ اسے فوری علاج کی ضرورت تھی۔

اور پھر۔۔۔ آخر میں اسے وہ ایک رات یاد آئی تھی۔ وہی رات جب وہ گھر چھوڑ کر کراچی چلی آئی تھی۔ گھر کو وداع کرنا مشکل تھا۔ مشکل ہی ہوتا ہے اس آشیاں کو وداع کرنا جہاں آپ نے اپنی زندگی کے اچھے برے دن دیکھے ہوں۔ جہاں کے در و دیوار میں آپ کی کھلکھلاہٹیں، آپ کے خواب گونجتے ہوں۔ لوگ سمجھتے ہیں گھر چھوڑنا آسان ہوتا ہے۔۔۔ ایسا نہیں ہوتا۔

گھر چھوڑنا مشکل ہوتا ہے۔ گھر کی یاد کے چند لمحات ایسے بھی ہوتے ہیں کہ سانس تک رکنے لگتا ہے۔ گھر چھوڑنا سہل نہیں ہوتا۔)

اس نے غزل کی سرخ پڑتی آنکھوں کو نرمی سے دیکھا تھا۔ اس کی خود کی آنکھیں بھی جل رہی تھیں۔ پھر نجانے کیسے اس کے منہ سے الفاظ خود بخود ادا ہونے لگے تھے۔

"مضبوط بنتے بنتے ایک ایسا وقت آتا ہے کہ ہماری روح تھک جاتی ہے۔ ہم انسان فریجائل ہیں۔ ہم پر مصیبت ٹوٹے تو ہمت کم پڑ ہی جاتی ہے۔ یہ نارمل ہے۔ اگر آپ کی ہمت بھی کبھی کم پڑ جاتی ہے، تو یہ اس بات کی ہی دلیل ہے کہ آپ انسان ہیں۔"، غزل نے اس کو ڈبڈبائی انکھوں سے دیکھا تھا۔ وہ اسے ہی دیکھ رہی تھی۔

"میں ڈپریسڈ ہوں، ایمان۔ مجھے گھبراہٹ ہوتی ہے۔ مجھے نہیں پتا کہ میں کیا کروں۔ اس دماغی حالت کے ساتھ کل کیسے کورٹ میں ڈٹی رہوں گی؟"، وہ اپنے بہتے آنسوؤں کو پونچھتی

عجیب اذیت سے بولی تھی۔ اس کی بات سنتے ہی ایمان افسردگی سے مسکرائی تھی۔ پھر دوبارہ سے مدھم سے انداز میں کہنے لگی تھی۔

"جانتی ہیں، غزل؟ ڈپریشن کیا ہوتا ہے؟ ڈپریشن ایک اندھیری رات کی مانند ہوتا ہے جو دل کے اندر بسیرا کر لیتی ہے۔ روشنی موجود ہوتی ہے، مگر دکھائی نہیں دیتی، ہنسی لبوں تک آتی ہے مگر سانس میں ٹوٹ جاتی ہے۔

یہ موسمِ خزاں جیسا ہوتا ہے۔۔۔ جو روح کے شجر سے سبز تازہ اوراق کو چھین لیتا ہے۔"، غزل کی سسکی کمرے میں گونجتی دیواروں سے ٹکرائی تھی۔ وہ ڈبڈبائی آنکھوں سے ایمان کو سنتی جا رہی تھی۔ اسے یہ الفاظ یاد تھے۔ یہ ایمان کے الفاظ نہیں تھے۔ وہ جانتی تھی کہ یہ کس کے الفاظ تھے۔ ایمان جانتی تھی کہ غزل کو اس وقت ان الفاظ کو دہرانے کی بے حد ضرورت تھی۔

"یہ تکلیف دہ ہوتا ہے۔ دل پر کبھی کبھار اتنا بھاری پڑتا ہے کہ لگتا ہے جیسے کوئی بھاری بھرکم سا بوجھ سینے پر لدا ہوا ہو، جو کبھی آپ کا سانس گھونٹنے لگے تو کبھی دم توڑنے لگے۔۔۔ یہ مشکل

ہوتا ہے۔۔۔اس سے چھٹکارا پانا ایسا ہے جیسے تاریکی میں راستہ تلاش کرنا۔یہ یکدم نہیں ختم ہوتا، آہستہ آہستہ ہوتا ہے۔ڈپریشن سے نکلنا یوں ہے جیسے ایک تھکی ہوئی روح تاریکی میں بھٹک رہی ہو اور آہستہ آہستہ دور ایک ننھا سا چراغ دکھائی دینے لگے۔وہ چراغ کبھی دعا کی روشنی سے جلتا ہے اور کبھی خود اپنی ہمت سے۔۔۔آگے بڑھتے رہو تو آخر کار غار ختم ہو جاتا ہے۔۔۔اور روشنی ہم تک پہنچ ہی جاتی ہے۔"

غزل اسے خاموش رہتی انکھوں کے ساتھ تکے گئی تھی۔وہ چھوٹی سی لڑکی بہت بڑی بڑی باتیں کہہ جاتی تھی،غزل نے ایک بار پھر اس بات کا اعتراف کیا تھا۔

www.novelsclubb.com

***

کراچی میں خزاں کی خشک دھوپ نے اپنے جوہر دکھانا شروع کر دیئے تھے۔آسمان پر کہیں کہیں بادل کا کوئی ٹکڑا نظر آتا۔گرمی حد درجہ تھی۔خشک ہواؤں نے چل کر موسم کو بھی خشک کر رکھا تھا۔درختوں کے پتے زرد و سرخ سے ہوئے زمین بوس ہوتے جا رہے

تھے۔۔۔وقت کافی تیزی سے گزرتا جا رہا تھا۔ہر شے کو اپنے ساتھ تیز رو میں لیے آگے بڑھتا جا رہا تھا۔

ایسے میں منظر کراچی کے سپریم کورٹ کی راہداریوں میں سے ایک کا ہے۔یوں تو پورے کورٹ میں خوب گہما گہمی تھی مگر اس حصے میں قدرے کم رش تھا۔اکا دکا لوگ آس پاس نظر آتے۔انہی لوگوں میں سے ایک وہ بھی تھی۔ایک جانب ستون کے ساتھ ٹیک لگائے،وہ سیاہ عبائے اور نقاب میں ملبوس عالم صاحب اور ارشد کبیر کے ساتھ کھڑی تھی۔چہرہ نہ دکھتا تھا مگر آنکھیں دکھتی تھیں۔۔۔اور آنکھیں تو دلوں کا حال کہہ دیا کرتی ہیں ناں!

وہاں اضطراب سا جھلکتا تھا۔اندر کہیں ایک خوف سا بھی دل سکیڑے ہوئے تھا۔بہت سے "اگر" تھے جو اگر آج نہ ہوئے تو وہ بکھر جائے گی۔نااُمید ہو جائے گی۔ہار جائے گی۔وہ جانتی تھی کہ اس کا ایمان اتنا مضبوط نہیں تھا جتنا لوگوں کو لگتا تھا۔آخر انسان تو وہ بھی تھی ناں!وہ بھی ایک کمزور انسان!

مگر نجانے کیا شے تھی جو اسے ڈھارس سی دیے ہوئی تھی۔ کہ وہ آج تیار تھی،باطل کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالنے کے لیے۔ آنکھیں گاڑھ کر غرانے کے لیے۔ بالکل رمیص جہانزیب کی طرح۔ وہ بھی تیار تھی سب پس پشت ڈال کر انصاف کی تلاش کرنے کو۔

جبھی سیاہ ٹی شرٹ اور سفید پینٹ میں ملبوس تازہ دم سا فیضان دور سے چلتا ان کی جانب آتا دکھائی دیا تھا۔ اس کی چال میں ایک ٹھہراؤ سا تھا۔ چہرہ اور آنکھیں سنجیدہ۔ لب ایک لکیر میں سلے۔ ان تک پہنچ کر اس نے سلام کیا تھا جس کا جواب ان سب نے ہی دیا تھا۔ عالم صاحب اب اسے کچھ فائلز کھولے دکھا رہے تھے۔ ارشد صاحب بھی انہی کی جانب متوجہ تھے۔ غزل خود کے عین سامنے کچھ فاصلے پر موجود کورٹ روم کو دیکھ رہی تھی۔ کورٹ روم کے دروازے کے عین اوپر کیل سے تختی ٹھکی ہوئی تھی جس پر کچھ الفاظ کندہ تھے۔ یا شاید کسی کا نام۔ اس نے گردن ذرا سی ڈھلکائی تھی۔ اب کے اس تختی پہ لکھے نام کا نیم رخ اسے دکھ رہا تھا۔

"مسٹر منصف اکرم -ایکٹنگ جج"

وہ ایک پل کو ٹھہری تھی۔ یہ نام اس نے کہیں سن رکھا تھا۔ اس نے دماغ پر زور ڈالنے کی کوشش کی تھی۔ کہاں سنا تھا۔۔۔ اسے یاد نہیں آرہا تھا۔ جبھی کورٹ کی راہداریوں میں لگے اسپیکروں پر گونج ہوئی تھی۔

"عالم اقبال صاحب۔۔۔ اپنے پرنسپلز کے ساتھ کورٹ روم میں تشریف لائیے۔"،وہ یکدم ہی ٹیک ہٹا کر سیدھی ہوئی تھی۔ نظریں عالم صاحب تک گئی تھیں۔ وہ اسے ہی دیکھ رہے تھے۔ بلکہ وہ سب ہی اسے دیکھ رہے تھے۔

"آپ تیار ہیں، مسز رمیص؟"،انہوں نے سنجیدگی سے پوچھا تو اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ ارشد صاحب نے آگے بڑھ کر اس کے شانے پر ہاتھ رکھا تھا۔ نگاہیں اس کے چہرے پر جمائے انہوں نے بہت نرمی سے اس کا شانہ تھپتھپایا تھا۔

"اللہ تعالیٰ تمہارے ساتھ ہے، غزل۔"، نجانے کیوں وہ اسے ایک ریمائنڈر سا دینا چاہتے تھے۔ اس کی ہیزل رنگ آنکھیں ڈبڈبا سی گئی تھیں۔ سب نے قدم اندر کی جانب بڑھائے تھے۔ کمرۂ

عدالت میں داخل ہوتے ہی اس کی نظر سب سے پہلے جج کی جانب اٹھی تھی۔ وہ بینچ پر کروفر سے بیٹھے چہرہ اٹھائے ان کو اندر داخل ہوتے ہی دیکھ رہے تھے۔

ان کے ساتھ ہی کلرک اور کورٹ رپورٹر موجود تھے۔ کچھ ہی فاصلے پر گہری بھوری لکڑی کا ایک کٹہرا موجود تھا۔ جج کے عین سامنے دو میزیں ایک قطار میں ایک دوسرے سے کچھ فاصلے پر رکھی تھیں۔ ان میں سے ایک پر پراسیکیوٹر چند افراد کے ساتھ تشریف رکھے ہوئے تھا۔ ابرو ایک تکبر آمیز انداز میں بھینچ رکھی تھیں۔ اس کی نگاہیں کچھ مردوں کی معیت میں چل کر آتی اس نقاب والی لڑکی پر جمی تھیں۔ نگاہوں میں ایک حقارت سی تھی۔

غزل خاموش قدم اٹھاتی عالم صاحب کے ساتھ چلتی ہوئی مدعی کی میز تک آئی تھی۔ ان کے کرسی پر بیٹھتے ہی وہ کرسی کو ذرا پرے کھسکاتی ان سے فاصلے پر بیٹھ گئی تھی۔ نگاہیں ایک پل کو جج کی جانب اٹھی تھیں اور ایک پل کو ساکت ہوئی تھیں۔ وہ انہیں پہچانتی تھی۔ ہاں وہ پہچان گئی تھی انہیں۔

وہ پروفیسر منصف اکرم تھے۔ یونیورسٹی آف مانچسٹر میں پڑھنے کے دوران ہی اس کی ان سے جان پہچان ہوئی تھی۔ وہ وہاں لاء پڑھایا کرتے تھے۔ یوں تو غزل کا سبجیکٹ میڈیا سائنسز تھا مگر ایک کامپیٹیشن کے پیش نظر ان سے بات چیت ہو گئی تھی۔ ایک فلم سی تھی جو سلو موشن میں چلتی محسوس ہو رہی تھی۔ جج صاحب اب کچھ بول رہے تھے۔ اسے ان کی آواز آ تو رہی تھی مگر دماغ ان کی باتوں کو پراسیس نہیں کر پا رہا تھا۔ لب ہل رہے تھے اور ایک شور سا تھا جو آس پاس گونجتا محسوس ہو رہا تھا۔

جبھی کسی نے پیچھے سے اس کے شانے پر ہاتھ رکھا تو وہ ایک جھٹکے سے گویا ہوش میں آئی۔ ایک گہرا سانس لے کر پیچھے مڑ کر دیکھا تو پیچھے بیٹھے ارشد کبیر اسے ہی دیکھ رہے تھے۔ ان کی آنکھوں میں آج اسے ایک نمی سی دکھی تھی۔ وہ بے حد سنجیدہ تھے۔

"مسز رمیص، اب آپ کو کچھ دیر میں کٹہرے میں بلایا جائے گا۔"، جبھی اس کے داہنے جانب بیٹھے عالم صاحب اس کی جانب مڑ کر بولے تو اس نے نگاہیں پھیر کر انہیں دیکھا۔ وہ بھی ارشد

صاحب جتنے ہی سنجیدہ دکھتے تھے۔ "آپ ریڈی ہیں ناں؟"، عدالت کا لائحہ عمل وہ اسے پہلے ہی سمجھا چکے تھے۔ مگر ایک خوف سا تھا جس نے ان کے دل میں گھر کر رکھا تھا۔

غزل نے محض سر اثبات میں ہلایا تھا۔ پھر چہرہ موڑ کر جج صاحب کو دیکھا تھا۔ کچھ ہی دیر میں عدالت کی کارروائی شروع ہو چکی تھی۔ سب سے پہلے عالم صاحب کھڑے ہو کر جج صاحب کے سامنے گئے تھے۔ وہ اپنا موقف پیش کرتے ہر کچھ دیر میں مڑ کر غزل کی جانب بھی اشارہ کرتے۔ جج صاحب نہایت غور سے ان کی ہر ایک بات سن رہے تھے۔ ان کا انداز بتلاتا تھا کہ ذہن گہری سوچوں کا شکار تھا۔ پھر عالم صاحب نے اسے کٹہرے میں بلوایا تھا۔

ایک ٹھنڈی سانس بھر کر وہ میز پر ہاتھ رکھے اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ بہت سی نظریں اس کی جانب اٹھی تھیں۔ کچھ میں تکبر تھا، کچھ میں مان تو کچھ میں تجسس۔ وہ متوازن قدم اٹھاتی کٹہرے میں آ کھڑی ہوئی تھی۔ اب کے جج صاحب فرصت سے اس کی جانب متوجہ ہوئے

تھے۔عالم صاحب کٹہرے کے قریب آکر کھڑے ہوئے چہرہ اٹھائے اسے دیکھتے اب تحمل سے پوچھ رہے تھے۔

"آپ کا نام؟"

"غزل رمیص۔"،اس نے سر اٹھائے سنجیدگی سے جواب دیا تھا۔

"مقتول رمیص جہانزیب سے آپ کا کیا رشتہ تھا؟"

لفظ "مقتول" بہت زور سے اندر تک چبھ گیا تھا۔ کھب گیا تھا۔ایک تکلیف نے سر اٹھایا تھا۔مگر اس بار آنکھیں سوکھی رہی تھیں۔نہ نمی اتری تھی نہ گلابی پن۔

"بیوی ہوں میں ان کی۔"،اس نے سنجیدگی برقرار رکھتے ہوئے جواب دیا تھا۔

"اکیس مارچ کی رات گیارہ بجے کیا ہوا تھا؟"،عالم صاحب سنجیدگی سے پوچھ رہے تھے۔

"میں رمیص کے آفس سے واپس آنے کا انتظار کر رہی تھی مگر گیارہ بجے مجھے ان کی کال آئی جس میں وہ بہت پریشان تھے۔ کال پر انہوں نے مجھے بتایا کہ وہ ایمرجنسی میں کینیا روانہ ہو گئے تھے۔ اس وقت انہوں نے مجھ سے یہ کہا کہ وہ آفس کے کسی ضروری کام کے تحت وہاں جا رہے ہیں۔"، وہ بول کر خاموش ہوئی تھی۔ نگاہوں کے پار مہینوں پرانا ایک منظر گھوم کر رہ گیا تھا جو آج بھی اس کے ذہن کے پردوں پر من و عن نقش تھا۔

(اکیس مارچ، رات گیارہ بج کر دو منٹ:

رمیص جہانزیب کے گھر میں اس وقت نیم اندھیرا سا تھا۔ تقریباً سب ہی سو چکے تھے سوائے غزل کے۔ وہ اپنے کمرے میں یہاں سے وہاں، وہاں سے یہاں انگلیاں چٹخاتی ٹہلتی جا رہی تھی۔ برائٹ پرپل رنگ کے کرتا شلوار میں ملبوس، بالوں کو گول مول کر کے جوڑے میں مقید کیے وہ پریشان دکھتی تھی۔ سامنے ہی پلنگ پر اس کے سوٹ کا ہم رنگ دوپٹہ اور اس کا

موبائل پڑا تھا۔ جبھی موبائل پر رمیص کا نام جگمگایا تو وہ ایکدم سے دوڑ کر پلنگ تک گئی اور کال ریسیو کر کے فون کان سے لگایا۔

"رمیص۔۔۔ کہاں ہو تم؟ کب سے ویٹ کر رہی ہوں میں۔ اتنی دیر لگا دی۔"، وہ تو جیسے ایک ہی سانس میں سب بول گئی تھی۔ اگلی جانب سے چند پلوں بعد رمیص کی ستی ہوئی آواز گونجی تھی۔

"غزل، میں پلین میں ہوں۔ کینیا جا رہا ہوں۔"، اور غزل کے بے چینی میں اٹھتے قدم ایک جھٹکے سے رکے تھے۔ آنکھیں بے اختیار ہی پھیلتی چلی گئی تھیں۔ وہ اب بھی اگلی جانب سے بولتا چلا جا رہا تھا۔ "رؤوف صاحب نے ارجنٹ بیسس پر بھیجا ہے۔ آفس کا کچھ کام ہے۔"

"ک۔۔۔ کیا مطلب؟ ایسے کیسے وہ اچانک تمہیں بھیج سکتے ہیں؟ بغیر کسی نوٹس کے؟"، وہ بے یقینی میں گھری وہیں کرسی کا ہتھا تھامے کرسی پر بیٹھتی چلی گئی تھی۔ آنکھوں میں نجانے کہاں سے ڈھیر ساری نمی امڈ آئی تھی۔ دل کی بے چینی بڑھ گئی تھی۔

www.novelsclubb.com

"ہوں۔۔۔پتا نہیں کیا ہو گیا مگر انہوں نے اچانک ہی بھیج دیا۔ مجھے خود کچھ سمجھ نہیں آیا۔ سب کچھ اچانک ہی ہو گیا۔"وہ اگلی جانب سے اسی ستے ہوئے انداز میں کہتا چلا جا رہا تھا۔ غزل کو اپنے دل کی دھڑکنیں بے طرح رفتار پکڑتی محسوس ہو رہی تھیں۔ کہیں کچھ غلط تھا۔ اسے اس بات کا احساس ہو رہا تھا۔ اور بہت شدت سے ہو رہا تھا۔

"رمیص۔"اب کے وہ جب بولی تو محض ایک ہی لفظ بولی۔ اس کے انداز میں بے بسی سی تھی۔ بے کسی اور لاچاری بھی!

کچھ لمحے خاموشی سے سرک گئے تھے۔ گھڑی کی سوئیوں کی ٹک ٹک کے ساتھ سانسیں بھی آگے بڑھتی جا رہی تھیں۔

"تم پلین میں ہو ابھی؟"اس نے مدھم سے نم لہجے میں دھیرے سے پوچھا تھا۔

"ہاں پلین میں ہی ہوں۔"اس کا جواب بھی اتنا ہی مدھم تھا جتنا کہ غزل کا سوال۔

"فون رکھ دوں میں؟"

www.novelsclubb.com

"نہیں۔"،اور وہ یکدم ہی تیزی سے اس کی بات ختم ہونے سے پہلے ہی بول پڑا تھا۔ پھر لہجہ دوبارہ سے ذرا نرم پڑا تھا۔ "نہیں رکھنا فون، پلیز۔ مجھ سے بات کرتی رہو۔ میرا دل عجیب سا ہو رہا ہے۔"

غزل کی آنکھیں مزید ڈبڈبا سی گئی تھیں۔ یہ کیا ہو رہا تھا اور کیوں ہو رہا تھا، اسے کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا۔

اس رات وہ بہت دیر تک ہلکی پھلکی باتیں کرتے رہے تھے۔ اسے یاد تھا کہ رمیس کی شروع والی گھبراہٹ بعد میں ختم سی ہو گئی تھی۔ وہ پہلے سے قدرے ریلیکسڈ ہو گیا تھا۔)

www.novelsclubb.com

کورٹ روم کا ماحول کافی تناؤ کا شکار لگتا تھا۔ جج صاحب ٹھوڑی تلے انگلی پر سوچ انداز میں رکھے ہوئے تھے۔ ان کی آنکھوں میں ایک الجھن سی نظر آتی تھی۔ جبکہ غزل سر اٹھائے اسی سنجیدگی کے ساتھ کھڑی تھی۔

"اوکے۔۔۔اب یہ بتائیے کہ تئیس مارچ کی دوپہر دو بجے رمیص جہانزیب نے آپ کو کسی غیر شناسا نمبر سے کال کی تھی، کیا ایسا ہی ہے؟"عالم صاحب نے اگلا سوال کیا تو اس نے سر اثبات میں ہلا دیا۔

"جی ایسا ہی ہے۔"

"اس فون کال میں انہوں نے آپ سے کیا کہا تھا؟"عالم صاحب کے پوچھنے پر وہ گرم کڑکتی دوپہر ایک بار پھر اس کی نگاہوں کے آگے گھوم کر رہ گئی تھی۔اسے وہ دوپہر آج بھی یاد تھی۔اس دوپہر کی تپش آج بھی محسوس ہو کر اس کے جسم پر رینگتی تھی۔ایک جھرجھری سی لی تھی اس نے۔

"وِڈیو کال تھی وہ۔اس میں وہ کسی سیف ہاؤس میں تھے۔"،اس نے سنجیدگی سے جواب دیا تھا۔

"اچھا تو کیا کہا تھا انہوں نے آپ سے؟"

www.novelsclubb.com

کورٹ روم کا منظر نگاہوں میں سے تحلیل ہونے لگا تھا۔ وہاں منظر ایک بار پھر سے وہی آ گیا تھا۔ وہی اس دوپہر والا ظالم منظر۔ سماعت کو اذیت پہنچاتی وہی زہر خند باتیں۔ دھڑکنوں کو روکنے والے وہی دردناک انکشافات۔

(وہ اپنے کمرے میں پلنگ پر بیٹھی ہوئی تھی۔ چہرہ بھیگا ہوا تھا۔ آنکھیں سوجی ہوئی تھیں۔ ہاتھ ہولے ہولے سے کپکپا رہے تھے۔ ارحم اسکول گیا ہوا تھا اور ثمرین کالج۔ وہ گھر پر اکیلی تھی۔ بالکل اکیلی۔ سامنے ہی موبائل کی اسکرین کھلی پڑی تھی جس میں رمیص کا چہرہ نظر آ رہا تھا۔ ملگجے سے لباس میں ملبوس وہ تھکان کا شکار لگتا تھا۔ سنہری بھورے سے بال ماتھے پر بکھرے ہوئے تھے۔ آنکھوں کے نیچے حلقے اور آنکھوں کی سفیدی میں گڑھی گُلابی ڈوریں رت جگی کی غماز تھیں۔

"رمیص، اب تم کیا کرو گے؟"، غزل پریشانی سے متورم آواز میں پوچھ رہی تھی۔ رمیص نے ایک گہرا سانس لے کر آنکھیں مسلی تھیں اور پھر چہرے پہ ہاتھ پھیرتا اسے دیکھنے گیا تھا۔

"پتا نہیں۔ ابھی تو مجھے خود کچھ سمجھ نہیں آرہا۔"، اس نے بے بسی کے عالم میں سر کو دونوں ہاتھوں میں گراتے ہوئے جواب دیا تھا۔ غزل یونہی گلابی پڑتی آنکھوں سے اسے چند لمحات کے لیے دیکھے گئی تھی۔

"رمیص، مجھے تو لگ رہا ہے کہ کچھ بہت غلط ہونے والا ہے۔ دل عجیب طریقے سے بے چین ہو رہا ہے۔ کوئی طوفان آنے والا ہے، رمیص۔۔۔ میں بتا رہی ہوں تمہیں۔"، وہ سر نفی میں ہلاتی بولتی چلی جا رہی تھی اور وہ ستی ہوئی آنکھیں اسی پہ جمائے اسے دیکھتا اور سنتا جا رہا تھا۔ کچھ لمحوں کے لیے پھر سے ایک گہری خاموشی چھا گئی تھی۔ پر اب کہ غزل کو یہ خاموشی اپنی ریڑھ کی ہڈی میں سنسناہٹ پیدا کرتی محسوس ہو رہی تھی۔ یوں جیسے یہ طوفان سے پہلے والی خاموشی ہو۔ سرد اور جان لیوا۔

"تم یوں کیوں نہیں کرتے کہ لندن بابا کے پاس چلے جاؤ؟ جب تک معاملہ ٹھنڈا نہیں ہوتا، کم از کم تب تک ہی۔"، اس کی بات پر رمیص کی آنکھیں نم پڑی تھیں۔ پھر اس نے شکست خوردگی کے عالم میں سر جھکایا تھا۔

"میں یہاں پھنسا ہوا ہوں، غزل۔ بہت بری طرح سے پھنسا ہوا ہوں۔ جکڑا ہوا ہوں۔ مجھ پر نظر رکھی جا رہی ہے۔ چوبیس گھنٹے۔۔۔ یہاں تک کہ میرے کمرے کی بالکنی تک میں کیمرا فٹ ہوا ہوا ہے۔ کمرے کے باہر جب بھی جاؤ، تین سے چار لوگ پہرا دیتے نظر آتے ہیں۔ آئی ایم اسٹک، غزل۔"، وہ ہر لمحے مزید نم ہوتی آنکھوں کے ساتھ بولتا جا رہا تھا اور غزل کو اپنی جان رکتی محسوس ہو رہی تھی۔

وقت نے بہت بری طرح پلٹا کھایا تھا۔ کل تک اس کا جو کنبہ خوش و خرم پرفیکٹ زندگی گزار رہا تھا، آج اسے اس میں دراڑیں پڑتی نظر آ رہی تھیں۔ اس کا سائبان اس سے بہت دور

انجانے دیس میں پھنسا ہوا تھا اور وہ یہاں تن تنہا خود کو سنبھالنے کی تگ و دو کر رہی تھی۔ بعض اوقات زندگی بھی کتنی مشکل ہو جاتی ہے ناں!

"سی ایم، زوالفقار بٹ ہے اس سب کے پیچھے۔ مجھے کچھ دن پہلے ایک انجانے نمبر سے کال آئی تھی۔۔۔" اب کے رمیص بولا تو غزل کا سانس خشک ہونے لگا۔ "میں اس کی آواز پہچان گیا تھا۔ وہ زوالفقار بٹ ہی تھا۔ اس نے واضح طور پر مجھے دھمکیاں دی تھیں کہ میں اس سب سے پیچھے ہٹ جاؤں ورنہ میرا انجام اچھا نہیں ہو گا۔ میں نے انکار کر دیا تھا، غزل۔" وقت کی گزرتی دھار میں نمی گھلنے لگی تھی۔ رمیص کا چہرہ بار بار نگاہوں میں دھندلاتا جا رہا تھا اور وہ ہاتھ کی پشت سے آنکھیں رگڑتی جا رہی تھی۔ وہ اب بھی مدھم سے لہجے میں بولتا جا رہا تھا۔

"اس کال کے اگلے دن ہی چینل کو سیل کر دیا گیا، غزل۔ میں نے تمہیں کچھ نہیں بتایا۔۔۔ میں تمہیں پریشان نہیں کرنا چاہتا تھا۔۔۔" اب کے وہ سر جھکا گیا تھا۔ غزل نے لب بھینچ کر آنسو بے دردی سے رگڑ ڈالے تھے۔

novelsclubb@gmail
www.novelsclubb.com
IG: @novelsclubb

"اچھا۔۔۔ تو اب کیوں بتا رہے ہو؟ اب بھی نہ بتاتے۔"، وہ خفا سے زیادہ متفکر لگتی تھی۔

"تو یہ بتاؤ کہ اگر چینل ہی سیل کر دیا گیا تھا تو تم اتنے دنوں سے روز آفس کا کہہ کر کہاں جا رہے تھے؟"، اصل سوال تو اس نے اب کیا تھا۔

"رؤوف صاحب نے اپنے اثر و رسوخ سے اس سیل کو ہٹوا دیا تھا۔ آفس ہی جا رہا تھا میں ان سب دنوں۔"، اس نے دھیمے لہجے میں بتایا تو غزل نے سمجھ کر سر ہلا دیا۔

"دو دن پہلے وزیراعظم صاحب کو ان کے دھرنے کے بیچ سے اریسٹ کر لیا گیا تھا۔ اس کے فوراً بعد ہی ان کے تمام کارکنوں کو اریسٹ کیا جانے لگا۔ کچھ کو ملک بدر کر دیا گیا۔۔۔"، یہاں وہ ایک پل کو تھما تھا۔ غزل کو ایک آنسو اس کی آنکھ سے نکل کر رخسار پر لڑھکتا نظر آیا تھا۔

"میں بھی انہی لوگوں میں سے ہوں، غزل۔ مجھے بھی ملک بدر کر دیا گیا ہے۔"

اور وہ ایک پل غزل رمیس پر بھی بہت بھاری تھا۔ اس روز اسے جدائی کا اصل معانی معلوم پڑا تھا۔ وہ ٹوٹ کر بکھر گئی تھی۔ سمیٹنے والا وہاں موجود نہیں تھا۔ اس کی دسترس سے بہت

دور، میلوں دور تھا۔ وہ تنہا تھی یہاں۔ تنہائی یکدم ہی کاٹ کھانے کو دوڑتی محسوس ہوئی تھی۔ رمیص جو اس کے ساتھ نہ تھا۔ اسے رمیص سے محبت سے زیادہ اس کی عادت پڑ گئی تھی۔ اور عادتیں تو یوں بھی جان نکال لیا کرتی ہیں ناں!

اسے اچھی طرح یاد تھا کہ اس روز اس نے پہلی بار رمیص کو بری طرح ٹوٹے بکھرے ہوئے دیکھا تھا۔ وہ قریب ہوتا تو وہ اس کے اشک اپنی پوروں پہ سمیٹ لیتی۔ اس کی ذات کی بکھری کرچیوں کو بکھرنے ہی نہ دیتی۔

"زوالفقار بٹ نے میرے بہت سے ساتھیوں کو مار ڈالا ہے، غزل۔۔۔ مگر میں، فیضان اور اصغر ابھی تک مرنے سے بچے ہوئے ہیں۔ فیضان کو آج صبح چار بجے اس کے گھر سے پکڑ کر جیل میں ڈال دیا گیا ہے۔ البتہ اصغر چھپا ہوا ممبر ہے۔ اس کے اس سب میں ملوث ہونے کی خبر ہمارے اور چند ایک مزید لوگوں کے سوا کسی کو نہیں ہے۔ وہ سب کے سامنے کلین ہے۔ ایک عام سا جرنلسٹ اور اینکر۔"، غزل کی آنکھوں سے پانی ٹپ ٹپ بہتا چلا جا رہا تھا۔ وہ

خاموش آنسو بہاتی اس کے انکشافات سن رہی تھی۔ کچھ دیر بعد بولتے بولتے وہ ٹھہرا تھا۔ آنکھوں میں اس ایک پل غزل کو سنجیدگی کے پہاڑ نظر آئے تھے۔

"غزل۔"، اس نے مدھم سے لہجے میں اسے مخاطب کیا تو اس نے بغیر آنسو پونچھے ہی اسے ڈبڈبائی آنکھوں سے دیکھا۔

"ہوں؟"، اس کی آواز بمشکل سنائی دی تھی۔

"میں تمہیں آج کچھ بہت اہم میلز بھیج رہا ہوں۔ یہ میری بے گناہی اور ذوالفقار کی گناہ گاری کے ثبوت ہیں۔ تم ان کو محفوظ رکھنا۔ یہ میری امانت ہیں اور تم ان کی امین۔"، غزل نے سمجھ کر سر ہلایا تھا۔ اب کے رمیص نے ایک گہرا نم سانس خارج کیا تھا۔

"مجھ سے ایک وعدہ کرو گی؟"، اس نے دھیمے لہجے میں ایک آس سے پوچھا تھا۔ وہ انکار کیسے کرتی؟

"حق کا ساتھ دینا اور ظلم کے خلاف کھڑی ہونا۔ ایسے میری بیوی ہونے کا حق نبھا دو گی۔"

novelsclubb@gmail
www.novelsclubb.com
IG: @novelsclubb

وہ ایسی باتیں کیوں کر رہا تھا؟ کوئی اس لڑکے کو بتائے کہ وہ یہ سب نہ کہے۔ اس سے اس نازک سی لڑکی کا دل ٹوٹ کر ریزہ ریزہ ہونے لگا ہے۔ کوئی روکے اس لڑکے کو کہ اس کا دل ریزہ ریزہ نہ کرے۔

"میری بیٹی کا نام ارحہ رکھنا، غزل۔ اس کو میری کمی کبھی محسوس نہیں ہونے دینا۔ تمہیں صرف خود کو نہیں، سب کو سنبھالنا ہے۔ وقت کڑا ہے۔ آزمائش ہے۔ دنیا کا ساتھ فانی ہے۔"، کہتے ہوئے اس نے شہادت کی انگلی اوپر کی جانب اٹھائی تھی۔ اس کی سنہری آنکھیں بری طرح جھلملا رہی تھیں۔ "وہاں کا دائمی ہے۔")

وہ منظر یہیں کہیں کورٹ کی فضا میں معلق ہو کر رہ گیا تھا۔ اس کی آنکھیں ہلکی نم ہو کر چمک سی رہی تھیں۔ عالم صاحب جواب کے منتظر اسے ہی دیکھ رہے تھے۔ اس نے ایک گہرا سانس فضا کے سپرد کیا تھا اور اسی ناز سے سر اٹھائے اس نے تحمل سے جواب دیا تھا۔

"رمیص نے اس روز مجھے بتایا تھا کہ اسے ملک بدر کر دیا گیا ہے اور یہ کہ اس سب کے پیچھے ذوالفقار بٹ ہے۔"، ابھی وہ مزید بولتی ہی کہ پراسیکیوٹر یکدم ہی اپنی نشست سے ایک جھٹکے سے کھڑا ہوا تھا۔

"آبجیکشن یور آنر۔ مقتول کی اہلیہ بغیر کسی ثبوت یا گواہ کے ذوالفقار صاحب جیسے شریف النفس، عوام کے خیر خواہ انسان پر الزام عائد کر رہی ہیں۔ لہٰذا ان کا یہ بیان خارج کیا جائے۔"، اس کے لہجے اور انداز میں غرور کی ایک نمایاں جھلک تھی۔ غزل نے عالم صاحب کو دیکھا تھا اور عالم صاحب نے جج کی جانب دیکھا تھا۔ جج صاحب نے کروفر سے سر اٹھا رکھا تھا۔ ان کا چہرہ حد درجہ سنجیدہ تھا۔

"آبجیکشن اوور رولڈ۔ آپ اپنی بات جاری رکھئے۔"، جج صاحب کے کہنے کی دیر تھی۔ جہاں پراسیکیوٹر حیرت میں گھر ادھم سے اپنی نشست پر بیٹھا، وہیں عالم صاحب کے لب ایک طرف کو اٹھ کر ہلکا سا مسکائے۔ انہوں نے غزل کو بولنے کا اشارہ کیا تھا۔

"میرے پاس زوالفقار بٹ کے خلاف بہت اہم ثبوت موجود ہیں۔ اور وہ ثبوت مجھے اسی روز رمیص نے دیے تھے۔"، وہ سنجیدگی سے جج صاحب کو دیکھتے ہوئے بولی تو وہ حیران ہوئے۔

اسی دم پراسیکیوٹر نے چہرہ موڑ کر پیچھے کی جانب دیکھا تھا۔ آخری قطار میں بالکل آخری نشست پر زوالفقار بٹ بیٹھا تھا۔ اس کا چہرہ کرخت اور لب سختی سے آپس میں پیوست ہوئے ہوئے تھے۔ اس کے دائیں جانب اس کا سیکریٹری بیٹھا پراسیکیوٹر کو ہی دیکھ رہا تھا۔ آنکھوں ہی آنکھوں میں کچھ اشارہ کیا تو پراسیکیوٹر سر ہلا کر چہرہ موڑ گیا۔ عالم صاحب اب ایک سیاہ کور والی اینویلپ فائل جج صاحب کو دکھا رہے تھے۔ جج صاحب نے خاصی دلچسپی سے فائل کھول رکھی تھی اور چہرہ جھکائے اندر موجود کاغذات کو پڑھ رہے تھے۔

وہ رمیص کے اس روز بھیجے گئے ای میلز کے پرنٹ آؤٹ تھے۔ جوں جوں ان کی نگاہیں اوپر سے نیچے کی جانب آتی جا رہی تھیں، ان کے چہرے پر سنجیدگی بڑھتی جا رہی تھی۔ انہوں نے کچھ دیر بعد سر اٹھا کر عالم صاحب کو دیکھا تو انہوں نے بولنا شروع کیا۔

"پہلی ای میل رمیس جہانزیب نے بیس مارچ کی صبح، نو بج کر پینتیس منٹ پر فیضان ارمغان کو کی تھی۔ اس ای میل میں ذوالفقار بٹ کے کالے کرتوتوں میں سے چند کے ریکارڈ موجود تھے۔ کرپشن، رشوت، غیر قانونی ٹیکس، غیر قانونی کمپنیوں وغیرہ کی تمام معلومات آپ کی نظروں کے سامنے ہے۔"، وہ بول کر خاموش ہوئے تو جج صاحب نے نگاہ اٹھا کر آخری نشست پر بیٹھے ذوالفقار بٹ کو دیکھا۔ وہ ایک نگاہ اتنی سرد تھی کہ ذوالفقار کو پہلو بدلنے پر مجبور کر گئی۔ ماتھے سے پسینے کی ایک بوند لڑھکتی کنپٹی تک جا پہنچی۔

"آبجیکشن یور آنر۔ اگر ان باتوں کو مان بھی لیا جائے کہ ذوالفقار صاحب ان غیر قانونی سرگرمیوں میں ملوث ہیں، تب بھی یہ بات کہیں سے بھی ثابت کردہ نہیں ہے کہ رمیس جہانزیب کے قتل میں بھی انہی کا ہاتھ ہے۔"، پراسیکیوٹر کی دلیل پر جہاں ذوالفقار صاحب پانی پانی ہوئے تھے، وہیں عالم صاحب شدید حیرت سے پراسیکیوٹر کی جانب مڑے تھے۔ وہ کیا کر رہا تھا؟ کیا وہ بے وقوف تھا یا ضرورت سے زیادہ چالاک؟

عدالت کی کاروائی جوں جوں آگے بڑھتی جارہی تھی،زوالفقار ٹھنڈا پڑتا جارہا تھا۔عالم صاحب نے فیضان کو گواہ کے طور پر پیش کیا تھا۔وہ اس سب کا شاہد تھا جو رمیص اور اس کے کنبے پر گزری تھی۔اسے شروع سے آخر تک ہر چیز کا علم تھا۔بالآخر کورٹ چیمبر میں ایک گھمبیر سی خاموشی چھا گئی۔ ہر ذی روح دم سادھے جج صاحب کے بولنے کی منتظر تھی۔وہ مدھم آواز میں اپنے اسسٹنٹ سے کچھ کہہ رہے تھے۔وہ سر ہلاتا اب اپنے پاس کچھ نوٹ کر رہا تھا۔آخر کار جج صاحب نے چشمہ ناک پر پیچھے کو کرتے سر ہلکا سا جھکائے سب کو دیکھا تھا۔پھر مائیک لبوں کے قریب کرتے وہ بولنا شروع ہوئے تھے۔

"تمام ثبوتوں اور گواہ کو مدنظر رکھتے ہوئے عدالت اس نتیجے پر پہنچی ہے کہ چیف منسٹر،زوالفقار بٹ صاحب،رمیص جہانزیب کے قتل میں ملوث پائے جاتے ہیں۔گواہ اور ثبوت اس بات پر مدلل ہیں کہ اکیس مارچ کو رمیص کو ملک بدر کرنے کے بعد انہیں کینیا کے جس ہوٹل میں ٹھہرایا گیا،وہاں ان پر نظر رکھی گئی۔اور پھر موقع ملتے ہی انہیں اغواء کر لیا گیا۔ذہنی اور

جسمانی تشدد کا نشانہ بنایا گیا اور پھر بالآخر انہیں تیس مارچ، دو ہزار چوبیس کو قتل کر دیا گیا۔

قانون شہادت، آرٹیکل چھیالیس کے تحت، Dying declaration کے مطابق یہی

نوے فیصد حقیقت ہے۔"

(قانون میں ایک خاص استثنا (exception) موجود ہے جسے " **dying declaration**" یعنی "مُنزِلِ موت بیان" کہتے ہیں۔ یہ قانونی اصول دراصل یہ مانتا ہے کہ جو شخص موت کے قریب ہوتا ہے، اس کے الفاظ سچ ہونے کا امکان زیادہ ہوتا ہے، کیونکہ وہ اپنی آخری سانسوں میں جھوٹ بولنے کا خطرہ مول نہیں لے گا۔)

"عدالت کے روبرو یہ مقدمہ پیش ہوا کہ مقتول رمیص کو کینیا میں قتل کروایا گیا۔ مقتول نے اپنی موت سے قبل ویڈیو اور آڈیو ریکارڈنگز اپنی اہلیہ غزل کے حوالے کی، جس میں اس نے واضح طور پر بیان کیا کہ اس کی زندگی کے خاتمے کی سازش وزیرِ اعلیٰ، زوالفقار بٹ، نے کینیا کی مدد سے کی ہے۔ یہ ریکارڈنگ عدالت میں بطور dying declaration اور الیکٹرانک

شہادت پیش کی گئی۔ فارنزک ماہرین نے تصدیق کی کہ یہ ریکارڈنگز اصلی ہیں اور ان میں کوئی جعل سازی یا ترمیم نہیں کی گئی۔ مزید یہ کہ ٹیلی کمیونی کیشن ریکارڈ اور عینی شہادت نے بھی اس الزام کی تائید کی۔ عدالت کی رائے میں پاکستان میں موجود ناقابلِ تردید شواہد اس بیان پر غالب ہیں۔ قانون شہادت کے مطابق اور اصولِ عدل کے تحت شک کا فائدہ صرف وہاں دیا جا سکتا ہے جہاں شک موجود ہو، جبکہ یہاں ثبوت واضح اور قطعی ہیں۔"، انہوں نے ایک لحظے کو رک کر چہرہ غزل کی جانب اٹھایا تھا۔ اور یہاں وہ بالکل مدھم سا مسکرائے تھے، اتنا مدھم کہ ایک لمحے سے بھی کم کے وقت میں ان کی مسکراہٹ غائب ہو گئی تھی۔ غزل سانس روکے انہیں سنتے ہوئے، اس لمحے ساکت ہوئی تھی۔ کیا وہ اسے پہچان گئے تھے؟

"لہٰذا عدالت اس نتیجے پر پہنچی ہے کہ وزیرِ اعلیٰ براہِ راست اس قتل کی سازش اور عمل میں شریک رہے۔ یہ جرم قتلِ عمد کے زمرے میں آتا ہے، جس کی سزا تعزیراتِ پاکستان کی دفعہ 302 کے تحت سزائے موت یا عمر قید ہے۔ وزیرِ اعلیٰ کو مجرم قرار دیتے ہوئے عدالت انہیں

جیوڈیشل ریمانڈ میں دیتی ہے۔ مزید یہ کہ ریاستِ پاکستان کو ہدایت دی جاتی ہے کہ اس فیصلے پر عمل درآمد کو یقینی بنایا جائے۔۔۔اور ولیؔ دم کو حکم دیتی ہے کہ کینیا کی حکومت سے mutual legal assistanceلائی جائے۔"

(جب ایک ملک کے پاس کسی دوسرے ملک کے شہری یا جرم سے متعلق شواہد، گواہ یا ریکارڈ موجود ہوں،اور دوسرا ملک ان شواہد کو مانگے تاکہ انصاف ہو سکے، تو اس تعاون کو Mutual Legal Assistance(باہمی قانونی تعاون) کہتے ہیں۔)

"عدالت برخاست ہوتی ہے۔"،اسی کے ساتھ وہ گاؤن جھٹکتے اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ زوالفقار کا چہرے لٹھے کی مانند سفید پڑ رہا تھا۔ عرش سے فرش پر آ گرنا کیا ہوتا ہے،اسے آج سمجھ آیا تھا۔ مگر یہ کیسے ممکن تھا؟اس نے تو اس جج کو خرید لیا تھا ناں!اتنا سب کچھ درہم برہم کیسے ہو گیا تھا؟

غزل نم آنکھوں کے ساتھ ارشد صاحب کے ساتھ لگی ہوئی تھی۔ دل بھر بھر آرہا تھا۔ انسانوں کی اس دنیا میں انصاف پانا مشکل ہے مگر رب کی لکھی ہوئی لوح محفوظ منصفانہ فیصلے کرتی ہے۔ وہ باقاعدہ کپکپا رہی تھی۔ جیسے رونگٹے سے کھڑے ہو رہے تھے۔ کیا اللہ تعالیٰ یوں نگاہوں کے سامنے سب کچھ صحیح کر رہا تھا؟ اتنی واضح نشانیاں صرف اس کا رب ہی دکھا سکتا تھا۔ اس کا پھوٹ پھوٹ کر رونے کا دل چاہ رہا تھا۔ باقی سب کی آنکھیں بھی نم تھیں۔ فیضان سرخ پڑتی آنکھوں کے ساتھ عالم صاحب کے گلے لگا ہوا تھا۔ وہ شاید رو رہے تھے۔ ان سب کے رونگٹے کھڑے ہو رہے تھے۔

www.novelsclubb.com

***

دوپہر سوا نیزے پر تھی۔ موسم کے وہی حال احوال تھے۔ خزاں کی مخصوص خشکی موسم میں اب بھی گھلی ہوئی تھی۔ رمیص جہانزیب کے گھر پر گہری خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ لاؤنج میں ثمرین کے ہمراہ وہ سنجیدہ سی بیٹھی ہوئی تھی۔ ارحہ اور ارحم کو ان کے چاچو اپنے ساتھ اپنے گھر

لے گئے تھے۔ غزل اور ارشد کو بھی کورٹ سے سیدھا ان کے ہاں ہی جانا تھا، سو اس وقت وہ دونوں گھر میں تن تنہا تھیں۔ گھر میں دبیز خاموشی کی تہہ سی جمی تھی۔ وہ دونوں بھی اسی تہہ کا حصہ معلوم ہو رہی تھیں۔ ابھی چند ہی منٹوں پہلے ارشد صاحب نے کال کر کے انہیں کورٹ کے فیصلے کے متعلق اطلاع دی تھی۔ تب سے دل سے بوجھ کچھ سر کا تھا۔

جبھی ایک دم سے ثمرین نے اسے دیکھا تھا۔

"یہ سائیکالوجی ڈیپارٹمنٹ کی لڑکی کے ساتھ بڑی دوستی ہو گئی ہے تمہاری۔ تمہیں پورے کیمپس میں ڈھونڈ رہی ہوتی ہوں اور آخر کار تم مجھے اس کے ساتھ ہی بیٹھی ملتی ہو۔"، اس کے کہنے پر ایمان ہلکا سا کھلکھلائی تھی۔

"ہاں یار۔ مزا آتا ہے مجھے اس کے ساتھ۔ بہت فنی ہے وہ۔"، وہ مسکرا کر بولی تو ثمرین نے اسے یوں دیکھا جیسے اس نے کوئی انہونی بات کہہ دی ہو۔ اس کی آنکھیں واضح طور پر پھیلتی نظر آئی تھیں۔

www.novelsclubb.com

"ہانا ظفر؟؟؟اور فنی؟؟؟"۔وہ جتنا حیران ہوتی،اتنا کم تھا۔ایمان نے معصومیت سے سر اثبات میں ہلا دیا تھا۔ ثمرین کو اس کی دماغی حالت پر شبہ سا ہوا تھا۔

"کیا ہو گیا، بہن؟ہانا ظفر کتنی روڈ ہے،کون نہیں جانتا؟میں نے تو اسے اب تک کسی کے ساتھ ہنستے ہوئے نہیں دیکھا۔"وہ بولی تو اب کی بار حیران ہونے کی باری ایمان کی تھی۔ وہ صوفے پر سیدھی ہو بیٹھی تھی۔

"ہانا؟؟؟اور روڈ؟مذاق کر رہی ہو کیا؟اتنی سوئیٹ سی ہے۔ فنی سی۔"۔ثمرین نے اس کی بات ختم ہونے سے پہلے ہی سر نفی میں ہلایا شروع کر دیا تھا۔ وہ کم از کم اس بات پر تو اتفاق نہیں کر سکتی تھی۔

"مجھ سے ایک دو بار بات ہوئی ہے اس کی۔ ایک کام کی بات کرنے کے بعد دوسری بات تو کرتی نہیں ہے وہ۔ مجھے تو یہ سمجھ نہیں آ رہی کہ تمہارے ساتھ وہ اتنی فرینک کیسے ہو گئی کہ میڈم کو وہ فنی تک لگنے لگی؟"

www.novelsclubb.com

"وہ اچھی ہے۔ مجھے تو وہ اچھی لگی۔"، ایمان نے اب کے شانے اچکا کر یوں کہا جیسے اس کے پاس ثمرین کی کنفیوژن کا کوئی جواب نہ ہو۔ وہ ہانا سے ہوئی پہلی ملاقات کو یکسر بھول چکی تھی۔

"ایسا کیا کرتی ہے وہ؟ تمہیں مشورے دیتی ہے کیا کہ فلانے سے ایسے نمٹو اور ڈھمکانے سے ایسے؟ لگتی تو اسی ٹائپ کی ہے۔"، ایک تو ثمرین اور اس کی ہر بات کو بڑھا چڑھا کر بولنے والی عادت! ایمان نے سر جھٹکا تھا۔ اب کے جب وہ بولی تو نجانے کیوں مگر لہجے میں ایک مسکراہٹ سی محسوس ہوتی تھی۔

"کچھ لوگوں کے مشوروں سے زیادہ ان کی موجودگی اہم ہوتی ہے۔ وہ کچھ نہ کہیں، بس آپ کے ساتھ رہیں، یہی بہت کچھ ہیل کر دیتا ہے۔ وہ بھی ایسی ہے۔ ویسے تو وہ مجھے مشورے بھی دیتی ہے مگر وہ مشورے نہ دے، صرف میری لیے موجود رہے، میرے لیے یہ بھی بہت ہے۔"، وہ بولی تو ثمرین نے خشمگیں نگاہوں سے اسے گھورا۔ پھر ذرا آگے بڑھ کر اس کے کاندھے پر چیونٹی کاٹی۔

"دیکھ لی تمہاری دوستی، بے ایمان۔ وہ کل کی آئی لڑکی اتنی عزیز ہو گئی تمہیں؟"، اس کے چڑے ہوئے انداز میں کہنے پر ایمان نے قہقہہ لگایا تھا۔ اور پھر وہ بے اختیار ہنستی چلی گئی تھی۔ ثمرین کے مصنوعی غصے کے تاثرات بھی ڈھیلے پڑتے گئے تھے۔ اب کے ایک ہلکی سی مسکراہٹ نے اس کے لبوں کا احاطہ کر لیا تھا۔

"اچھا بس بھی کرو اب۔ اتنی اچھی نہیں لگ رہی۔"، وہ بولی تو ایمان نے ہنستے ہنستے اسے دیکھا۔ یہ اس کے ارد گرد ہر کوئی اتنا کیوٹ کیوں تھا؟

"میری اس سے بات چیت ہوئے ابھی چند ہی ہفتے ہوئے ہیں بس۔ ابھی تو میں اس کو پوری طرح جانتی بھی نہیں !ہاں مگر وہ اچھی ہے۔"، اس کی ہر بات کی سوئی اسی ایک بات پر آ کر رک رہی تھی۔ ثمرین نے اتفاق کرنے کے سے انداز میں سر ہلایا تھا۔

"ہاں مان لیا کہ وہ اچھی ہے۔"، اس کے جتاتے انداز میں کہنے پر ایمان کھلکھلا دی تھی۔

"وہ یونہی میری زندگی میں آگئی ہے اور میری نیگیٹو سی زندگی میں ایک پازیٹو سی انسان بن کر میرا دل ہلکا سا کر دیتی ہے، ثمرین۔ میری زندگی میں بہت سارے لوگ ہیں جو خاص ہیں۔۔۔ مگر ان خاص لوگوں میں وہ ایک ہی ہے جو اپنے جیسی ہے۔ اور کہیں ناں کہیں،شاید میری جیسی بھی!"،ایمان بولی تو ثمرین ہلکا سا مسکرا دی۔

باہر گرمی بہت تھی مگر گھر کے اندر بیٹھے اتنی محسوس نہیں ہوتی تھی۔ جانور اور پرندے چھاؤں کی تلاش میں مارے مارے پھر رہے تھے۔ وہ دونوں کھڑکی کے شیشے کے پار اب بھی ہنستی مسکراتی نظر آرہی تھیں۔ یوں جو بھاری سی کثافت صبح سے گھر میں چھائی تھی،وہ چھٹنے لگی تھی۔

***

گاڑی درمیانی رفتار سے سڑک پر آگے بڑھتی جارہی تھی۔ ڈرائیونگ سیٹ پر ارشد بیٹھے تھے۔ ان کے برابر میں ہی پیسنجر سیٹ پر غزل بیٹھی تھی۔ وہ زید کی طرف جارہے تھے۔ غزل کی

آنکھیں سرخ پڑ کر دہک رہی تھیں۔ گود میں دھرا ہاتھ ہولے ہولے سے کپکپا رہا تھا۔ نگاہیں سرمئی سڑک کی پیچھے کو جاتی دھار پر مرکوز تھیں۔ اے سی کی خنکی نے اس کے وجود کو اپنے حصار میں لیے اسے ساکت سا کر رکھا تھا۔ ارشد صاحب نے ڈرائیونگ کرتے ہوئے گلابی آنکھوں سے ایک پل کو اسے دیکھا تھا۔ پھر انہوں نے نگاہیں پھر سے پھیر لی تھیں۔ وہ اس کے دل کی کیفیت جانتے تھے۔ یہ فتح بھی اس کے لیے کرب ہی تھی۔ اب دنیا کی کوئی فتح اسے ویسے نہیں ہنسا سکتی تھی۔

ہنسی جیسے اس ایک انسان کے ساتھ ہی دم توڑ گئی تھی۔

"بیٹے۔۔۔"، انہوں نے مدھم آواز میں اسے مخاطب کیا تھا۔

"ہوں۔" چہرہ ہنوز کھڑکی کی جانب موڑے اس نے کہا تو اس کی آواز زکام زدہ سی تھی۔ بکھری ہوئی سی۔

www.novelsclubb.com

"تم کہو تو تمہیں گھر چھوڑ دوں؟ آرام کر لو۔ ارحم اور ارحہ کو میں خود جا کر لے آتا ہوں۔"،وہ نرمی سے بولے تو اس نے سر نفی میں ہلایا۔

"نہیں۔ مجھے ابھی ان سے مل کر انہیں زور سے گلے لگانا ہے،بابا۔ میرے جلتے دل کو ایسے ہی قرار آئے گا۔ اور ویسے بھی،زید سے بھی ملنا ہے۔ عدت کے بعد اس سے ملاقات نہیں ہوئی۔"،اس کے کہنے پر ارشد صاحب نے ایک گہرا نم سانس خارج کیا تھا۔ پھر افسردگی سے اسے دیکھا تھا۔ جوان بیٹی کا غم کیا ہوتا ہے،یہ ان کے چہرے پر نظر آرہا تھا۔ ان کی ہیزل انکھوں میں عجیب بے بسی سی جھلکتی تھی۔ وہی بے بسی جو ایک باپ کو اپنی اولاد کے لیے کچھ نہ کرپانے پر ہوتی ہے۔

"ٹھیک ہے۔ جیسی تمہاری مرضی۔"،وہ بول کر توجہ پھر سے روڈ پر مرکوز کر گئے تھے۔

غزل یونہی روڈ کو تکتی جارہی تھی۔ اس کی جھلملاتی آنکھوں کے پار کئی مناظر آج بھی پوری آب و تاب سے جم کر بیٹھے تھے اور ان مناظر کی یادیں اسے پل پل اذیت دیا کرتی تھیں۔ سڑک کی

سرمئی دھاران مناظر کے پیچھے چھپتی چلی گئی۔ وقت نے پلٹا کھایا اور اس دن جا پہنچا جب بربادی کے بگل بجائے گئے تھے۔

(تیس مارچ،2024)

ایک عجیب سی خاموشی تھی جس نے گھر میں ڈیرہ جمایا ہوا تھا۔ بہار کا موسم جا رہا تھا۔ گرمی کی تپش اب جھلسانے لگی تھی۔ ایسے میں غزل لاؤنج میں ثمرین کے ساتھ بیٹھی تھی۔ دوپہر کے بارہ بجنے والے تھے۔ ارحم اسکول گیا ہوا تھا۔ وہ دونوں خاموشی میں گھرے معلوم ہوتے تھے۔ پرسوں سے رمیص سے کوئی رابطہ نہیں ہوا تھا۔ غزل بے حد پریشانی کے عالم میں نجانے کتنی بار اسے کال ملا چکی تھی۔ مگر وہ تھا کہ ایک بھی کال پک نہیں کر رہا تھا۔

جبھی اس کے سامنے صوفے پر پڑا اس کا موبائل تھرتھرایا تو اس نے تیزی سے موبائل اٹھا کر دیکھا۔ کال رمیص کی نہیں تھی۔ ضوفشاں کی تھی۔ ایک گہرا سانس لے کر کال پک کر کے اس نے فون کان سے لگایا تھا۔

novelsclubb@gmail
www.novelsclubb.com
IG: @novelsclubb

"ہاں ہیلو، ضوفی۔ السلام علیکم۔"،اس نے مرے مرے سے انداز میں کہا تو اگلی جانب سے ضوفشاں کی رونے کی واضح سی آواز ابھری۔

"غزل۔ت۔۔۔ تم ٹھیک ہو؟"،اس کی آواز باقاعدہ کپکپا رہی تھی۔غزل کے دل کی دھڑکنوں نے بے اختیار رفتار پکڑی تھی۔کہیں کچھ غلط ہوا تھا،بہت غلط!

کیا غلط ہوا تھا،یہ اسے ابھی معلوم پڑنے والا تھا۔

"کیا ہوا ہے،ضوفی؟ کیا ہونا ہے مجھے؟"،اسے نجانے کیوں رونا آنے لگا تھا۔اس کا دل کہہ رہا تھا کہ کچھ ٹھیک نہیں ہے۔اس کا دل اسے سگنلز دے رہا تھا۔سرخ رنگ کے جلتے بجھتے سگنلز!

"نصیر نے ابھی بتایا کہ۔۔۔۔"،ضوفی کی سسکی ابھری تھی۔غزل کی آنکھوں سے آنسو ٹپکتے چلے گئے تھے۔دو دن سے بھاری پڑتا دل اسے آج سرزنش کر رہا تھا کہ اس کے ساتھ کچھ بہت برا ہو چکا ہے۔کچھ ایسا جو اس کا دل چیر دینے کی حد تک سفاک تھا۔

تبھی اگلی جانب نصیر نے ضوفشاں کے ہاتھ سے موبائل لیا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ وہ نہیں کہہ پائے گی کچھ!

"غزل۔ میری بات دھیان سے سنیں۔"، وہ ٹھہرے ہوئے انداز میں بولا تو غزل نے بے ساختہ اپنے لب دانتوں تلے دبائے۔ اور اس کے بعد نصیر نے اس سے جو کہا تھا، وہ اس کی دنیا ایک جھٹکے میں اجاڑ گیا تھا۔ "رمیص کو قتل کر دیا گیا ہے، غزل۔ میرے پاس بہت سے لوگوں کی کالز آ رہی ہیں۔ میں نے بھی ابھی ہی نیوز کھولی ہے۔ نیوز میں بھی یہی بتا رہے ہیں۔"، وہ مزید بھی کہہ رہا تھا مگر اس کا دماغ اس پہلے جملے پر ہی اٹک کر رہ گیا تھا۔ آنکھیں جھپکنا بھول گئی تھیں۔ دل کی دھڑکنیں بھی شاید ایک پل کو تھمی تھیں۔ ثمرین اس کے سفید پڑتے چہرے کو تفکر سے دیکھ رہی تھی۔

"یہ کیا بکواس ہے ؟"، بے یقینی سے اس نے ٹی وی کا ریموٹ پکڑ کر ٹی وی آن کیا تھا۔ ہاتھ سے موبائل چھوٹ کر صوفے پر گر گیا تھا۔ وہ تیزی سے کھڑی ہوئی تھی۔ سامنے ہی نیوز چینل کھلا پڑا تھا۔ اینکر حلق پھاڑ کر کچھ کہہ رہی تھی۔

"رمیص جہانزیب کو کینیا میں چند دن پہلے اغواء کیا گیا اور آج ان کی ڈیڈ باڈی ہوٹل انتظامیہ کو ان کے ہوٹل روم سے ملی ہے۔ باڈی کی حالت بہت تشویش ناک بتائی جا رہی ہے۔ مزید خبروں سے آپ کو ہمارے نمائندے آگاہ کرتے چلیں گے۔ جی بابر، بتائیے۔"، اس کی آنکھوں میں بہت سے آنسو آ جمع ہوئے تھے۔ لب پھر پھرائے تھے۔ ابھی دو دن پہلے ہی تو بات ہوئی تھی اس کی رمیص سے۔ پچھلے لمحے وہ صحیح تھا، زندہ تھا اور اس لمحے سب تہس نہس؟

نمائندہ اب بہت کچھ بتا رہا تھا۔ ثمرین کی چیخوں سے گھر گونج اٹھا تھا۔ وہ کانوں پر ہاتھ رکھے ہذیانی انداز میں چیخ رہی تھی۔ غزل بے دم سی صوفے پر گر گئی تھی۔ اس کا دل سکڑ کر پھیل رہا تھا۔ پھیل کر سکڑ کر رہا تھا۔ سر کے پچھلے حصے میں یکدم ہی درد کی خطرناک ٹیسیں اٹھتی محسوس

ہوئی تھیں۔ سر کے پچھلے حصے سے درد اب ہوتا ہوا دل تک آپہنچا تھا۔ جبھی موبائل ایک بار پھر تھرتھرانے لگا تھا۔ مگر اس بار نہ اس میں اسے اٹھانے کی ہمت تھی نہ ثمرین میں۔ اسکرین پر جلتا بجھتا ارشد صاحب کا نام افسردگی اور ہمدردی سے ان دونوں کو تک رہا تھا۔ ثمرین اب اس سے لگی رو رہی تھی۔ وہ اب بھی بے حرکت بیٹھی تھی۔ نگاہیں ٹی وی کی اسکرین پر نظر آتے رمیص کے چہرے پر ٹکی تھیں۔

کسی نے پوچھا تھا کہ کیا کسی کی کل کائنات ایک لمحے میں لٹ سکتی ہے؟

ہاں! ایک لمحہ کسی کی کل کائنات اجاڑنے کے لیے کافی ہوتا ہے۔ بہار کے پھولوں کے بعد جہنم کی آگ آنے میں کبھی کبھار ایک لمحہ ہی درکار ہوتا ہے۔ بس ایک لمحہ!

ایک ہفتے بعد کلیئرنس کے بعد رمیص کی باڈی پاکستان پہنچ چکی تھی۔ پہنچنے سے پہلے اسے مطلع کر دیا گیا تھا۔ ضوفشاں اور نصیر کے ساتھ ساتھ ارشد کبیر بھی جلد ہی پاکستان پہنچ گئے تھے۔ ان کے خاندان میں ایک کہرام سا مچ گیا تھا۔

www.novelsclubb.com

اطلاع ملنے پر ارشد صاحب کے ساتھ وہ اس کی باڈی پہنچنے سے پہلے ہی ہسپتال میں موجود تھی۔ ہسپتال میں بھی ہنگامی صورتحال تھی۔ وہاں کا سارا عملہ رمیص کے پرستاروں میں شامل تھا۔ جب سے نیوز پر پہلی بار خبریں نشر ہوئی تھیں، ملک بھر میں ایک ہنگامہ سا مچ گیا تھا۔ لوگ بلک بلک کر رو رہے تھے۔ ہر جگہ بس ایک ہی بات ہو رہی تھی، اس ایک شخص کی بات جو جاتے جاتے بہت سے لوگوں کو آنسو تھما گیا تھا۔۔۔

وہ ایک نشست پر سر جھکائے بیٹھی تھی۔ سیاہ عبائے اور نقاب میں۔۔۔ دونوں ہاتھ گود میں دھرے تھے۔۔۔ آنکھوں میں قحط کا سا سماں تھا۔ جیسے وہ رو رو کر خشک پڑ چکی ہوں۔ جیسے ان کی ہر چمک ماند پڑ چکی ہو۔ اس کے برابر میں ہی ارشد صاحب نم آنکھیں لیے بیٹھے تھے۔ ان کے گھٹنوں پر رکھے دونوں ہاتھ تھر تھرا رہے تھے۔ دل کی کیفیت بھی ناقابلِ بیان تھی۔ انہوں نے سر اٹھا کر داخلی راستے کی جانب کر رکھا تھا۔ یکدم ہی ان کے بائیں جانب سے دو نرسیں دوڑتی ہوئی ان تک آئی تھیں۔ دونوں کے تنفس پھولے ہوئے تھے۔

www.novelsclubb.com

"باڈی آ گئی ہے ان کی۔"،وہ جلدبازی میں بول کر رکی نہیں تھیں۔ تیزی سے باہر کی جانب بڑھ گئی تھیں۔ پیچھے غزل نے چہرہ اٹھا کر دھیرے سے ارشد کو دیکھا تھا۔اس کی قحط زدہ آنکھیں اس پل ایک بار پھر سے جھلملائی تھیں۔ لب ہولے سے لرزے تھے۔دل ڈوب کر ابھرا تھا۔ آج یہاں وہ ایک امید لیے آئی تھی۔ایک آخری امید کہ شاید باڈی رمیص کی نہ ہو۔شاید سب جھوٹ بول رہے ہوں۔شاید۔۔۔شاید!

نجانے ایسے کتنے ہی "شاید" حائل ہو گئے تھے،اس کے اور رمیص کے بیچ!زندگی اور موت کے بیچ!یقین اور بے یقینی کے بیچ!

ارشد صاحب نے نم آنکھوں سے اسے دیکھتے ہوئے دھیرے سے اس کا ہاتھ تھام کر کھڑا کیا تھا۔دور داخلی دروازے سے لوگوں کے جھرمٹ میں سے راستہ بناتے پولیس اہلکار ایک اسٹریچر کھینچتے ہوئے اسی جانب لا رہے تھے۔ ہر ایک آواز،ہر ایک شخص دور کسی پس منظر میں جا چکا تھا۔اسٹریچر کے پہیوں کی چرچراتی آواز اس کے اعصاب پر بہت بھاری پڑ رہی تھی۔ان

اہلکاروں کا رخ غزل کے پیچھے موجود مورچری کی جانب تھا۔ وہ ان تمام لوگوں کے بیچ اسٹریچر روکنے کا خطرہ نہیں لے سکتے تھے۔ یہ عوام رمیص جہانزیب کے پیچھے جتنی پاگل تھی، یہ سب جانتے تھے۔

اسٹریچر اندر لے جایا جا چکا تو اس نے تیز ہوتی دھڑکنوں کے ساتھ چہرہ اٹھا کر ارشد صاحب کو دیکھا۔ اس نے ان کا بازو کسی واحد سہارے کی مانند تھام رکھا تھا۔ جیسے اگر اسے چھوڑ دیا تو ہمت چھوٹ جائے گی۔ سہارا لٹ جائے گا۔ اب وہ اسے لوگوں کے بیچ سے راستہ بناتے مورچری میں لے کر جا رہے تھے۔ وہ ٹپ ٹپ گرتے آنسوؤں کے ساتھ ان کے ساتھ جاتی جا رہی تھی۔ اندر پولیس اہلکار اب اس کے اوپر سے چادر ہٹا رہے تھے۔۔۔ مردہ خانے میں موت سی خاموشی چھائی تھی۔

ایک جانب بہت سی میتیں سفید کپڑوں سے ڈھکی پڑی تھیں تو بالکل اگلی جانب ان میتوں سے الگ تھلگ ایک اسٹریچر رکھا تھا۔ پولیس والے اب کپڑا چہرے سے ہٹانے کے بعد باہر

کی جانب بڑھ گئے تھے۔ ارشد صاحب زلزلاتی ٹانگیں بمشکل اٹھاتے آگے بڑھ رہے تھے۔ وہ دروازے میں ہی کھڑی رہ گئی تھی۔ بند دروازے پر ہاتھ رکھے وہ گہرے گہرے سانس لیتی اسی جانب دیکھ رہی تھی۔ اتنی دور سے اسے اس کا چہرہ نہیں دکھ رہا تھا۔ اور وہ شاید دیکھنا بھی نہیں چاہتی تھی۔ آج زندگی میں پہلی بار وہ یہاں رمیص کا چہرہ نہیں دیکھنا چاہتی تھی۔

دروازہ بند تھا۔ ایک تاریک ساسماں تھا۔۔ لگتا تھا گویا اسی تاریکی میں وہ بھی ڈوبی ہوئی ہے۔ سامنے میت کے پاس زارا کھڑی تھی۔ وہ منہ پر ہاتھ رکھے رو رہی تھی۔

ذرا قریب پہنچتے ہی ارشد صاحب نے آنکھیں تکلیف سے بند کی تھیں۔ انہوں نے پچھلے ایک ہفتے ہر لمحے یہ دعا کی تھی کہ آج جو چہرہ وہ دیکھیں، وہ رمیص کا نہ ہو۔ دنیا جو کہہ رہی تھی، انہیں اس سے سروکار نہیں تھا۔ وہ ہر لمحہ بس یہی دعا کرتے رہے تھے۔ آج مہر لگ گئی تھی کہ ان کی یہ دعا محفوظ کر لی گئی تھی کیونکہ یہ دعا قبول ہونے کے لیے نہیں کی گئی تھی۔

novelsclubb@gmail
www.novelsclubb.com
IG: @novelsclubb

غزل ڈوبتے دل اور برستی آنکھوں کے ساتھ دھیرے دھیرے سے قدم اٹھانے لگی تھی۔ اس کا دل اتنی زور سے دھڑک رہا تھا کہ لگتا تھا کہ ابھی نکل کر باہر آجائے گا۔ ہر گزرتی سانس پچھلی سانس سے بھاری ہوتی جارہی تھی۔ سینے پر حد درجہ دباؤ محسوس ہو رہا تھا۔ ایک قدم۔۔۔

دوسرا قدم۔۔۔

تیسرا قدم۔۔۔

اور پھر چوتھا قدم۔۔۔

اسے اسٹریچر پر لیٹے وجود کے چہرے کی ہلکی سی جھلک نظر آئی تھی۔ وہ چہرہ۔۔۔

آہ! وہ چہرہ اسی کا تھا! وہ چہرہ کیوں تھا اس کا؟ وہ چہرہ نہیں ہونا چاہئے تھا اس کا!

قدم اسے گھسیٹتے اسٹریچر تک لے گئے تھے۔ وہ نہیں جانا چاہتی تھی! اب وہ اسٹریچر کے بالکل پاس کھڑی تھی۔ سامنے رمیص لیٹا تھا۔ آنکھیں بند کیے۔ سفید چادر اس کے سینے تک تھی یوں کہ بازو اور کاندھے دکھائی دیتے تھے۔ غزل نے اپنے لرزتے ہاتھ بمشکل بڑھا کر اس کا چہرہ

چھوا تھا۔اس کے چہرے کا یہ کیا حال ہوا ہوا تھا؟اس نے اپنے رمیص کو آخری بار گھر سے ایسے تو نہیں وداع کیا تھا۔ مردہ خانے کی موت سی فضا میں اس کی آوازیں گونجنے لگی تھیں۔

"آہ۔۔۔"اس کی آواز تھر تھرا رہی تھی۔"ہاہہہہ۔۔۔اللہ۔"،وہ بے یقینی سے بے ربط الفاظ بول رہی تھی۔ بلکہ کوئی لفظ ادا ہو ہی کہاں رہا تھا؟دل پسیج رہا تھا یا تڑپ رہا تھا،وہ کچھ نہیں سمجھ پا رہی تھی۔ سسکیوں اور آہوں کے درمیان گھرا اس کا وجود رمیص کو دیکھتے کمزور پڑنے لگا تھا۔ اس کے ماتھے کے عین درمیان میں ایک سیاہ سا گڑھا تھا۔وہ گولی کا نشان تھا۔اس کا منہ ہلکا سا سوج بھی رہا تھا۔بند آنکھیں بھی نیلی سی پڑ رہی تھیں۔ بھورے سنہرے سے بال بکھرے ہوئے تھے۔غزل کی آنکھوں کا یہ منظر آنسوؤں سے بار بار دھندلاتا جا رہا تھا۔ہلکی بڑھی ہوئی شیو اس کی انگلیوں کے پوروں تلے محسوس ہو رہی تھی تو دل میں چبھن سی ہو رہی تھی۔رمیص کے وجود کا ہر لمس آج کھردرا سا محسوس ہو رہا تھا۔

"یا اللہ!"، وہ خود کی ڈھارس بندھانا چاہتی تھی۔۔۔ مگر اس وقت سب ناممکن تھا۔ سانس لینا تک دشوار تھا۔

اس نے ہاتھ رمیص کے چہرے پر پھیرتے ہوئے اس کی آنکھوں پر رکھے تھے۔ کیوں تھیں یہ آنکھیں بند؟ کیوں؟

دھیرے دھیرے ہاتھ اس کے سفید کپڑے کے نیچے پڑے ہاتھوں کی جانب کر کے اس نے جونہی اس کا ہاتھ چادر کے نیچے سے نکالا، اس کی آنکھیں ساکت ہو گئیں۔ اس کے بائیں ہاتھ کے تین ناخن جڑ سے غائب تھے۔ ان کی جگہ تازہ زخموں کی بدنما سی بھدی کھال دکھائی دیتی تھی۔ وہ جیسے بے یقینی سے کچھ کہنے لگی تھی مگر آواز اور الفاظ اس کے حلق میں ہی کہیں گھٹ گئے۔ وقت ٹھہر گیا۔ ہر دکھ آج کے اس دکھ کے سامنے چھوٹا پڑ گیا۔ ہر آزمائش اس سامنے کھڑی آزمائش کے آگے بے معنیٰ ہو گئی۔ اس کے ہاتھ کو دونوں ہاتھوں میں مقید کیے، اس

کے اکھڑے ناخنوں کی جلد پر ہاتھ پھیرتے اس نے چہرہ آہستہ سے اوپر کیا تھا۔ سرخ متورم آنکھیں تکلیف جھلکاتی تھیں۔۔۔

آنسو اتنے تھے کہ سب دھندلاتا جا رہا تھا۔ اور پھر اگلے ہی پل مردہ خانے کی ان بے رحم در و دیوار نے جاں گسل چیخیں سنی تھیں۔ ضبط کے بندھن ٹوٹ گئے تھے۔ اندر موجود شور باہر آنے لگا تھا۔

"یا اللہ!"، وہ منہ پر دونوں ہاتھ رکھے بہت اذیت سے چیخ رہی تھی۔ ان چیخوں میں، ان صداؤں میں وہ تکلیف تھی جو بیان سے باہر تھی۔ "یا اللہ! میرا رمیص۔۔۔ یا اللہ! میرا رمیص۔۔۔"، وہ چیختے چیختے زمین پر بیٹھتی چلی گئی تھی۔ ٹانگوں سے ساری جان سلب کر لی گئی تھی۔ یہ اس کے ساتھ، اس کی ہنستی بستی زندگی کے ساتھ کیا ہو گیا تھا؟ آنسو بے لگام اس کی آنکھوں سے برستے اس کے نقاب کو بھگوتے جا رہے تھے۔ تکلیف اس کا سینہ بری طرح جکڑنے لگی تھی۔ دماغ کی ہر رگ درد کرنے لگی تھی۔ اس کے رونے کی جگر خراش آوازیں در و دیوار سے پلٹ کر واپس

آرہی تھیں۔ زارا اور ارشد صاحب اس کے پاس بیٹھے اسے حوصلہ دینے کی کوششیں کر رہے تھے۔ مگر یہ کوششیں آج بیکار تھیں۔ آج ہر کوشش رائیگاں تھی۔

دو روز بعد۔۔۔

نمازِ فجر ادا کر دی گئی تھی۔ مسجد میں ایک بہت بڑا جم غفیر جمع تھا۔ بہت سے لوگ تھے جن کی آنکھیں نم تھیں۔ انہی لوگوں میں ایک جانب ارشد صاحب اور اصفر کے ساتھ زید کھڑا تھا۔ دراز قد والا وہ ایک نہایت سلجھا ہوا انسان لگتا تھا جو فی الوقت غم سے نڈھال ہوا ہوا تھا۔ اس کی آنکھیں سرخ پڑ کر سوج رہی تھیں۔ چہرہ زرد سا دکھتا تھا۔ بھورے بال ماتھے پر بکھرے ہوئے تھے۔ وہ پچھلے دو مہینے سے کام کے سلسلے میں جرمنی گیا ہوا تھا۔ کل رات ہی واپس لوٹا تھا۔ اس کی رمیص جیسی سنہری آنکھیں رت جگے کی چغلی کھاتی تھیں۔ آج اس سے اس کا آخری رشتہ بھی چھوٹ گیا تھا۔ وہ شاید ایک بار پھر یتیم ہوا تھا۔ مگر تکلیف پہلے کی نسبت اب زیادہ محسوس ہوئی تھی۔

www.novelsclubb.com

نماز کے بعد جنازہ پڑھایا جانے لگا تھا۔ لوگ اس پورے وقت میں باقاعدہ آنسوؤں سے رو رہے تھے۔ ملک بھر میں ایک سوگوار سا ماحول تھا۔ یہاں سے کچھ گھنٹے پیچھے جائیں تو نگاہوں کے سامنے رمیص کے گھر کا وسیع لان آئے۔ ابھی تک لوگ اکٹھے نہیں ہوئے تھے۔ خالی پڑے لان میں ایک جانب تابوت رکھا تھا۔ اس کے اندر رمیص کا بے جان وجود کفن میں لپٹا رکھا تھا۔ زید کچھ لوگوں کے ہمراہ تابوت کو ابھی چند ہی لمحوں پہلے یہاں رکھ کر مسجد چلا گیا تھا۔ اب وقت آخری دیدار کا تھا۔

آخری ملاقات کا۔۔۔

دروازے سے بمشکل چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی غزل ضوفی کا بازو تھامے چلی آرہی تھی۔ اس کی آنکھیں متورم سرخ سی تھیں۔ ان کے پیچھے ہی ثمرین بھی لرزتے قدم اٹھاتی بہت مشکلوں سے چلی آرہی تھی۔۔۔ پورچ کے قریب لان کی گھاس پر تابوت رکھا گیا تھا۔ ثمرین نے پیچھے سے غزل کا دوسرا بازو جکڑ رکھا تھا۔ آسمان پر فجر سے پہلے کی سیاہی چھائی ہوئی تھی۔ وہ

تابوت تک پہنچی تو بے اختیار ضوفی سے ہاتھ چھڑواتی نیچے بیٹھتی چلی گئی۔ اسے رک رک کر سانس آ رہی تھی۔ سامنے سفید کفن میں لپٹا بے حس و حرکت جسم جس شخص کا تھا، وہ اس کی کل کائنات تھا۔ یقین کرنا مشکل تھا کہ اب وہ لوٹ کر نہیں آئے گا۔ یقین آتا بھی کیسے؟

اس نے دھیرے سے اپنا ہاتھ اس کی جانب بڑھا کر اس کے چہرے کے پاس سے کفن ہٹایا تھا۔ ضوفشاں نے ضبط سے آنکھیں بند کرتے چہرہ موڑ لیا تھا۔ مگر غزل اور ثمرین کی نگاہیں ساکت رہ گئی تھیں۔ کیا یہ واقعی وہ تھا؟ کیا کسی کے لیے ہماری زندگی سے یوں چلے جانا اتنا آسان ہوتا ہے؟ پھر ہمارے لیے اتنا مشکل کیوں ہوتا ہے؟ کیوں روح تک فنا ہونے لگتی ہے؟ کیوں سانسیں رکنے لگتی ہیں؟ کیوں ساری دنیا اس ایک شخص سے جدا ہونے پر بے معنی سی ہو جاتی ہے؟

آج اس کے آنسو خاموشی سے رخساروں پر بہتے چلے گئے تھے۔ آج وہ چیخی نہیں تھی۔ آج وہ چلائی نہیں تھی۔ رمیص جاتے جاتے اس کے الفاظ اپنے ساتھ لے گیا تھا۔ اس کی زبان پر کئی

بند باندھ گیا تھا۔ اور زندگی یوں ہی تو نہیں سکھا دیتی بڑے بڑے سبق۔ پہلے تڑپاتی ہے، گراتی ہے، رلاتی ہے، اکیلا کرتی ہے، پھر انسان کو وہ بناتی ہے جو بننا اس کا مقدر ہوتا ہے۔ ہائے بڑی سفاک ہے یہ زندگی!

آنسو خاموشی سے ٹپ ٹپ بہتے چلے جا رہے تھے۔ نگاہیں رمیص کے چہرے کو دیکھتی دھندلاتی جا رہی تھیں۔ اس کا ہاتھ آج آخری بار رمیص کا چہرہ چھو رہا تھا۔ پھر اس نے دھیرے سے ڈھیلے بندھے کفن سے اس کا وہی مسخ ہاتھ نکالا تھا۔ اب وہ اس کے ہاتھ پر دونوں ہاتھ پھیر رہی تھی۔ اس کی انگلیوں کو، اس کے زخموں کو چھوتے، دل تکلیف سے بھر بھر آ رہا تھا۔ جبھی ایک دم سے سب ساکت ہوا تھا۔ اس کے ہاتھ، اس کی نظریں، اس کے بہتے آنسو۔۔۔ اس نے یکدم ہی ہاتھ کی پشت سے آنکھیں رگڑ کر غور سے اس کے ہاتھوں کو دیکھا تھا۔ ہاتھوں کے ناخنوں کو، ناخنوں کے فری ایجز کو۔۔۔ وہ بڑھی ہوئی تھیں۔ اتنی کہ صاف نظر آتی تھیں۔ اسے یاد تھا کہ

www.novelsclubb.com

جب اس نے چند روز پہلے اسے دیکھا تھا تو ناخن چھوٹے تھے۔ وہ اس کے وہ زخمی ہاتھ نہیں بھول سکتی تھی۔ اسے چھوٹی سے چھوٹی ڈیٹیل یاد تھی۔

پھر نگاہیں بھٹک کر اس کے چہرے پر جا اٹکی تھیں۔ اس کی بڑھی ہوئی شیو پہلے سے قدرے بڑھی ہوئی تھی۔۔۔ اس نے بے حد شاک کے عالم میں اس کی شیو پر ہاتھ پھیرا تھا۔ اس لمحے اسے ایک ادراک بھی ہوا تھا۔ وہ مسکرا رہا تھا۔ وہ واقعی مسکرا رہا تھا۔ نہیں! وہ مسکرا نہیں رہا تھا! مگر اس کو دیکھ کر ایسا لگتا تھا کہ جیسے وہ مسکرا رہا ہو۔ وہ ایک دم سے کچھ قریب ہوئی تھی۔

"رمیص! رمیص، تم زندہ ہو؟" وہ اس کا چہرہ تھپتھپا رہی تھی۔ ضوفی نے آگے بڑھ کر اسے یکدم ہی پیچھے کیا تھا۔

"ضوفی، رمیص زندہ ہے۔ ضوفی، میں سچ کہہ رہی ہوں۔ وہ سچ میں زندہ ہے۔"، وہ حواس باختگی سے کہہ رہی تھی۔ ضوفی نے اسے پکڑ کر زور سے خود میں بھینچا تھا۔ وہ اس کی گرفت میں مسلسل مچل رہی تھی۔ ارشد صاحب نے آگے بڑھ کر رمیص کو ایک نظر دیکھا تھا۔ نجانے کیا

آیا ان کے جی میں کہ انہوں نے ہاتھ آگے بڑھا کر اس کی نبض چیک کی۔ وہاں زندگی کی کوئی رمق باقی نہیں تھی۔ پھر انہوں نے اس کے دل کے مقام پر ہاتھ رکھا۔ وہاں کوئی دھڑکن نہیں تھی۔ ایک گہرا سانس لے کر انہوں نے آخر میں اس کی ناک کے پاس ہاتھ رکھا۔ وہاں سانسوں کی گرمائش محسوس نہیں ہوتی تھی۔ پھر وہ ہولے سے غزل کی جانب مڑے تھے۔

"کیا ہوا ہے، بچے؟"، انہوں نے ڈبڈباتی آنکھوں سے اسے دیکھتے نرمی سے پوچھا تھا۔ غزل صوفی کی گرفت سے نکلتی تیزی سے ان کی جانب آئی تھی۔ ان کے مقابل آ کر اس نے انہیں بازوؤں سے تھاما تھا۔

"بابا، اس کے ناخن بڑھے ہیں۔ میں نے دیکھا تھا ناں اسے اس دن۔ تب اس کے ناخن چھوٹے تھے۔ میں نے اسے تصویر میں بھی دیکھا تھا، بابا۔ اس کی شیو نہیں تھی۔ اس کی شیو بھی بڑھی ہوئی ہے، بابا۔ آپ دیکھیں ناں۔ صحیح سے دیکھیں۔ مردہ انسان تو یخ ہوتا ہے ناں، بابا۔ یہ تو یخ نہیں تھا اس دن۔ یہ تو ابھی بھی یخ نہیں ہے۔"، اور وہاں کھڑے تمام لوگوں کے ذہن چند

www.novelsclubb.com

پلوں کے لیے ماؤف ہوئے تھے۔ سب کی نگاہیں اس کے چہرے کی جانب پھسلی تھیں۔ اس چہرے پر واقعی گرمائش دکھتی تھی۔ غزل نے اسے چھوا تھا۔ وہ ٹھنڈا نہیں تھا۔۔۔)

تمام مناظر کچھ پیچھے رہ گئے۔ سرمئی دھار چلتے چلتے رک گئی۔ گاڑی رک چکی تھی۔ ارشد صاحب اسے پکار رہے تھے۔ اس نے سرخ آنکھیں ان کی جانب موڑی تھیں۔ زید کا گھر آچکا تھا۔ اس نے ایک گہرا سانس لے کر آنکھیں رگڑتے ہوئے دروازہ کھولا تھا اور پھر اپنا پرس پکڑتے باہر نکل گئی تھی۔ سامنے ہی اسے کھڑکی کی گرل کے پار ارحم بیٹھا نظر آ گیا تھا۔ اسے دیکھتے ہی وہ کھلکھلا کر ہنستا پیچھے ہوا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ اب وہ دوڑتا ہوا دروازے تک آرہا ہو گا۔ دروازہ شمع نے کھولا تھا۔ وہ زید کی بیوی تھی۔ تقریباً تئیس سال تک کی وہ نہایت سلجھی ہوئی سی لڑکی تھی۔ ارحہ اس کی گود میں تھی۔ ارحم شمع کے پیچھے سے دوڑتا ہوا اس تک آیا تھا اور اس کے غزل کی ٹانگوں سے لپٹنے سے پہلے ہی غزل نیچے بیٹھتی اس کے گلے لگی تھی۔ اس کے گرد

دونوں بازو باندھے وہ اب رو رہی تھی۔ گرم سیال آنکھوں سے بہتا نقاب میں جذب ہوتا جا رہا تھا۔ ارحم کچھ حیران ہونے کے بعد اب دھیرے دھیرے اس کی پشت تھپتھپا رہا تھا۔

"آپ روئیں نہیں، مما۔ سب ٹھیک ہے۔"، وہ نجانے اس کے رونے کی وجہ کیا سمجھ رہا تھا۔ مگر جو بھی سمجھ رہا تھا، اس کے الفاظ غزل کو تسلی دے رہے تھے۔ نجانے کیسے! مگر اس کے آنسو آہستہ آہستہ تھمنے لگے تھے۔ کئی ماہ سے دل پر جو کثافت چھائی ہوئی تھی، وہ دھیرے دھیرے چھٹنے لگی تھی۔

اور شاید کبھی کبھی ہم اپنی زندگی میں موجود نعمتوں کو بہت فار گراں ٹڈ لے لیتے ہیں۔ جو چلے گئے، ان کے پیچھے ان کو بھی بھول جاتے ہیں جو پیچھے ہمارے پاس رہ گئے۔ اس نے بھی جانے انجانے میں یہی کیا تھا۔

***

رات کا اندھیرا کافی حد تک چھا چکا تھا۔ ہر ایک شے رات کی تاریکی میں ڈوبی اسی کا حصہ لگ رہی تھی۔ رمیس کے گھر میں آج خاموشی چھائی تھی۔ غزل بچوں کے ساتھ شام میں ہی لوٹ آئی تھی۔ تب سے سب ہی اپنے اپنے کمروں میں دبکے بیٹھے تھے۔ ایسے میں ایمان کے کمرے میں نظر دوڑائی جاتی تو وہ ایک جانب میز کے ساتھ کرسی لگائے بیٹھی تھی۔ لمبے سیاہ بال گول مول کر کے ڈھیلے سے جوڑے میں مقید کر رکھے تھے۔ چہرہ دھلا دھلایا بے داغ لگتا تھا۔ ہلکے پھلکے سے کپڑوں میں ملبوس وہ اپنے سامنے میز پر رکھے ڈبے کو کھول رہی تھی۔ بھوری پیکجنگ ہٹانے کے بعد اس نے اندر سے ببل شیٹ میں لپٹی کروم بک نکالی تھی۔ وہ سیاہ رنگ کی بالکل چمکتی ہوئی کروم بک تھی۔ اس نے یہ آج ہی آنلائن آرڈر کی تھی۔ چمکتی آنکھیں لیے اس نے پاور بٹن دبا کر اسے آن کیا تھا۔ چند ہی سیکنڈز میں اسکرین روشن ہو گئی تھی۔

چند منٹوں بعد دیکھا جاتا تو سامنے اسکرین پر ایک ڈرافٹ کھلا نظر آتا۔ اس ڈرافٹ کے سب سے اوپر وہ چند حروف ٹائپ کر رہی تھی۔ انگلیاں کی بورڈ پر آہستہ آہستہ کچھ توقف سے چل رہی

www.novelsclubb.com

تھیں۔ اس کی کی بورڈ پر اردو لکھنے کی پریکٹس نہیں تھی۔ اسکرین پر نظر گھماؤ تو سامنے بولڈ حروف میں ایک لفظ لکھا جا رہا تھا۔

ہر دبتے بٹن کے ساتھ اس لفظ میں مزید حروف جڑتے جا رہے تھے۔ جانتے ہو وہ لفظ کیا تھا؟

وہ تھا۔۔۔

"راہ گزر"

راہ گزر ہے یہ زندگی، چلتے ہی جانا ہے

کہیں رُکنا نہیں، خوابوں کو پانا ہے

وقت کی گرد اُڑتی ہے، منظر بدلتے ہیں

www.novelsclubb.com

اس سفر میں ہر پل نئے قصے نکلتے ہیں

کبھی خوشبوؤں کی چھاؤں، کبھی صحراؤں کی دھوپ

راہ گزر سکھاتی ہے صبر، سبق دیتی ہے خوب

جو مسافر ہمت رکھے، تھک کے نہ بیٹھے کہیں

منزلیں خود پکاریں گی، کہو ہم یہیں

INTERVAL

اگر آپ میں لکھنے کی صلاحیت ہے اور آپ اپنا لکھا ہوا دنیا تک پہنچانا چاہتے ہیں، مگر آپ کے پاس کوئی ذریعہ نہیں ہے۔۔تو ہم سے رابطہ کریں۔

ہماری ٹیم آپ کو قدم قدم پر رہنمائی فراہم کرے گی اور آپ کی لکھی ہوئی تحریر دنیا تک لائے گی۔

آپ اپنا لکھا ہوا ناول، افسانہ، شاعری، ناولٹ، کالم یا آرٹیکل پوسٹ کروانا چاہتے ہیں تو اپنا مسودہ ہمیں ورڈ فائل یا ٹیکسٹ فارم میں میل کریں

novelsclubb@gmail.com

آپ ہمارے فیس بک، انسٹا پیج اور واٹس ایپ کے ذریعے بھی ہم سے رابطہ کر سکتے ہیں۔

FB PAGE:

NOVELSCLUBB

INSTA:

NOVELSCLUBB

WHATSAPP: